2-12-0

Title - Intikhab-E-Zarrein

Creater - Murattiba Sayyed Raas Masri

Publisher - Nizami Press (Badaun)

Date - 1926

Pages - 308

Subjects - Urdu Shayari - Intikhab.

تمہید

کسی قوم کی تہذیب و تمدّن کے اندازہ کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کے سرمایۂ نظم کا مطالعہ کیا جائے۔

چند سالہائے گذشتہ سے میں یہ ضرورت محسوس کر رہا تھا کہ ایک ایسا انتخاب شایع کروں جس پر ایک نظر ڈالنے سے میرے ہم وطن دوستوں کو اردو نظم کے بہترین حصّہ کا لطف حاصل ہو جائے۔

یہ مجموعہ "انتخاب زرّیں" کے نام سے آج پیش کیا جاتا ہے نہ صرف ناظرین کے تفنّن طبع کا سبب ہوگا۔ بلکہ ان لوگوں کو جو اردو نظم کی خوبیوں کے ایک گونہ منکر ہیں ثابت کر دیگا کہ وہ اس معاملہ میں غلطی پر تھے اور اس کے مطالعہ سے ظاہر ہو جائیگا کہ اگر اردو شاعری کے بہترین حصّہ کا کسی دوسری قوم کی اچھی اچھی نظم سے مقابلہ کیا جائے تو اوّل الذکر کا درجہ گرا ہوا نہ رہیگا۔ درحقیقت جب اس بات پر غور کیا جاتا ہے کہ اردو وہ زبان ہے جس کا شمار زمانہ حال کی

تو نہ ایسے زبانوں میں ہے تو یہ ایک معجزہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قدر قلیل مدت
میں اُردو نظم کو وہ جلا دیدی گئی جو مہذب اور شستہ خیالات کے لیئے
اصل الاصول ہے۔

صرف ایک ذات واحد کا کیا ہوا انتخاب اُسی وقت ہر شخص کے مذاق
کے مناسب ہو سکتا ہے جبکہ مؤلف کو قدرت سے ذہانت کا کافی حصہ ملا ہو
(بدقسمتی سے میں اس سے کوسوں دور ہوں) جو اصول میں نے اس انتخاب
میں مدنظر رکھا ہے وہ نہایت سادہ ہے میں نہ شاعر ہوں نہ فن سخن کا نقاد کامل
لیکن مجھے اپنی قوم کے فن شعر کے ساتھ سچا عشق ضرور ہے میں نے وہی کلام
انتخاب کیا ہے جس کو میرے دل نے پسند کیا جن اشعار نے مجھ پر گہرا اثر کیا
انھیں کو میں نے اس تذکرہ میں لیا ہے اور جن اشعار سے صرف عارضی
اور فوری ولولہ پیدا ہوتا تھا اُن کو ترک کر دیا۔ خلاصہ یہ کہ میرا قلب ہی
اس معاملہ میں میرا رہنما تھا پس اگر ناظرین کو اس انتخاب میں کوئی سُقم نظر
آئے تو وہ اسے اُردو نظم کا نقص نہ خیال کریں بلکہ فی الواقع وہ اس کو
میرے مذاق کی کمی سمجھیں۔

میں اس موقع پر اس بات کا اظہار بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ مجموعہ
بالخصوص اُن اصحاب کے لیے مرتب کیا گیا ہے جو میری طرح اس نئی روح
پر جو ہماری شاعری میں پھونکی جا رہی ہے نگاہ رکھتے ہیں اور قدیم طرز
کے خیالات کے شیدائی نہیں ہیں یہی وجہ ہے کہ بہت سی مشہور غزلوں کو
جن میں وہ خیالی مضامین نظم کیے گئے ہیں جو ایک زمانہ میں ہماری ...

شاعری کی جان سمجھے جاتے تھے لیکن افسوس ! کہ موجودہ زمانہ میں اُن کا ہمارے جذبات پر کچھ اثر نہیں ہوتا، اس تذکرہ میں جگہہ نہیں دی گئی ہے۔

اس وقت تک اُردو نظم کے جس قدر انتخابات میری نظر سے گزرے ہیں اُن سب میں میرے معزز دوست مسٹر الیاس برنی پروفیسر معاشیات عثمانیہ یونیورسٹی کے انتخابات جو حال ہی میں شایع ہوئے ہیں بلا شبہ بہترین ہیں۔ انھوں نے ہر مضمون کی نظموں کو جداگانہ حصوں میں ترتیب دینے کی جو تکلیف اُٹھائی ہے میں کافی طور سے اس کی داد نہیں دیسکتا۔ اُن کی یہ کوشش جاری ہے اور وہ وقتاً فوقتاً اس کی اور جلدیں شایع کرینگے۔ اس کے مقابلہ میں اس مجموعہ کے پیش کرنے کے متعلق میری حقیر کوشش کچھ حقیقت نہیں رکھتی اور نہ وہ آئندہ جاری رہنے والی ہے۔ میں نے شعرا کا مختصر حال اور ان کا کلام اُن کے زمانہ کی ترتیب کے لحاظ سے دیا ہے۔ یعنی متوفی شاعروں کو اُن کی سن وفات کی ترتیب سے اور اپنے زمانہ کے زندہ شعرا کو اُن کی سال پیدایش کے لحاظ سے درج کیا ہے اگر میرے وہ دوست جو مجھ سے کچھ واقفیت رکھتے ہیں اس رسالہ کو مطالعہ کرنے کے بعد مجھ سے اور زیادہ خصوصیت کے ساتھ واقف ہو جائینگے تو میں یہ سمجھوں گا کہ میری محنت پورے طور سے وصول ہو گئی۔

خاکسار

سید راس مسعود

حیدرآباد دکن ۱۰ اگست ۱۹۲۱ء

حصّہ اوّل

(۱) ولی دکنی سنہ ۱۷۴۲ء

ولی محمدؔ یا ولی اسد نام تھا بعض "تذکرہ نویسوں نے ان کا نام شمس الدین لکھا ہے جو صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ ان کی ولادت اور وفات کے سال میں اختلاف ہے۔ بقول صاحب تذکرہ شعرائے دکن ولادت سنہ ۱۰۵۳ھ مطابق سنہ ۱۶۴۳ء اور وفات سنہ ۱۱۵۵ھ مطابق سنہ ۱۷۴۲ء میں ہوئی۔ یہی تاریخیں قرین قیاس معلوم ہوتی ہیں کہ ولی کا مولد اورنگ آباد (دکن) تھا اسی وجہ سے وہ دکنی مشہور ہیں۔ وفات احمد آباد (گجرات) میں ہوئی۔ ولی کو اردو شاعری کا "باوا آدم" کہا جاتا ہے اگرچہ اردو زبان میں ردیف و قافیہ کے التزام کے ساتھ غزل سرائی کرنے والے

شاعران سے پہلے بھی گزرے ہیں۔ ولی کے وقت سے ہمارے زمانہ کی اُردو
میں نمایاں فرق ہو گیا ہی اور ان کے دیوان کو موجودہ اردو ادب میں قدیم اُردو
کا مرتبہ حاصل ہو چکا ہی لیکن آج بھی باوجود صدیاں گزر جانے کے بعض بعض اشعار
اُن کے دیوان میں بہت صاف ملتے ہیں مثلاً وہ فرماتے ہیں ؎

مفلسی سب بہار کھوتی ہی
مرد کا اعتبار کھوتی ہی

ولی کا دیوان مختلف مطابع میں چھپ چکا ہی لیکن اب کمیاب ہی اس کا ایک
ایڈیشن پیرس میں نہایت اہتمام کے ساتھ ۱۸۳۳ء میں شایع ہوا تھا جس کا
دیباچہ فرانسیسی زبان میں مسٹر جے ہیل گریسن ٹاسی نے لکھا ہی۔ کلام کا نمونہ یہ ہی:

(۱)

دل طلبگار ناز مہوش ہی — لطف اس کا اگرچہ دلکش ہی
مجھ سوں کیونکر ملیگا حیراں ہوں — شوخ ہی بے وفا ہی سرکش ہی
کیا تری زلف کیا تری ابرو — ہر طرف سوں مجھے کشاکش ہی
تجھ بن ای داغ عشق سینہ و دل — چمن لالہ دشت آتش ہی

ای ولی تجربہ سے پاتا ہوں
شعلۂ آہ شوق بیغش ہی

(۲)

حسن تیرا سورج پہ فاضل ہی — مکھ ترا رشک ماہ کامل ہی

رات دن تجھ جمال روشن کوں
حس کوں تجھ حسن کا نہیں ہی خبر
عشق کی راہ کے مسافر کوں

فضل پروردگار شامل ہی
بےگماں وہ جہاں میں غافل ہی
ہر قدم تجھ گلی میں منزل ہی

ای ولی طرز عشق آسان نہیں
آزمایا ہوں میں کہ مشکل ہی

(۳)

غفلت میں وقت اپنا نہ کھو ہشیار رہو
کت تک رہیگا خواب میں بیدار رہو بیدار رہو
گر دیکھنا ہی مدعا اس شاہد معنی کا رو
ظاہر پرستاں سوں سدا بیزار رہو بیزار رہو
جیوں چتر داغ عشق کوں رکھ سر پہ اپنے اولاً
تب فوج اہل درد کا سردار ہو سردار رہو
وہ نور چشم عاشقاں ہی جیوں سحر جگ میں عیاں
ای دیدہ وقت خواب نیں بیدار ہو بیدار رہو

مطلع کا مصرع ای ولی ورد زباں کر رات دن
غفلت میں وقت اپناں نہ کھو ہشیار ہو ہشیار رہو

(۴)

مفلسی سب بہار کھوتی ہے — مرد کا اعتبار کھوتی ہے
کیونکہ حاصل ہو مجکو جمعیت — زلف تیری قرار کھوتی ہے
ہر سحر شوخ کی نگہہ کی شراب — مجھ انکھاں کا خمار کھوتی ہے
کیونکہ ملنا صنم کا ترک کروں — دلبری اختیار کھوتی ہے

اے ولی آب اس پری رو کی
میرے دل کا غبار کھوتی ہے

(۲) سودا (۱۷۸۱ء)

میرزا محمد رفیع نام ۱۱۲۵ھ کو دہلی میں ولادت ہوئی۔ ان کے بزرگ تجارت کرنے کے لیے کابل سے ہندوستان میں آئے تھے اور اسی رعایت سے انھوں نے سودا تخلص اختیار کیا تھا۔ شاہ حاتم کے تلامذہ میں نامور اور اپنے زمانہ کے مسلم الثبوت اُستاد تھے حضرت میر کے ہمعصر تھے اُنھوں نے قصائد کے لحاظ سے اُردو کو فارسی کا ہم پلہ بنا دیا تھا تمام اصناف سخن پر قدرت رکھتے تھے خصوصاً ہجو گوئی میں کمال حاصل تھا جب دہلی اُجڑ کر لکھنؤ آباد ہوا تو دیگر اہل کمال کے ساتھ شعرا میں سب سے پہلے میرزا صاحب لکھنؤ کو منتقل ہوئے اور وہیں بہ عمر ۷۰ سال ۱۷۸۱ء مطابق ۱۱۹۵ھ میں انتقال کیا ان کے کلیات کو ۱۱۹۵ھ میں حکیم سید اصلح الدین خان نے مرتب کیا تھا جو ہر جگہہ دستیاب ہو سکتا ہے۔

غزل (۵)

نسیم ہی ترے کوچہ میں اور صبا بھی ہی
ہماری خاک سے دیکھو تو کچھ رہا بھی ہی

ترا غرور مرا عجز تا کجا ظالم
ہر ایک بات کی ظالم کچھ انتہا بھی ہی

جلے ہی شمع سے پروانہ اور میں تجھ سے
کہیں ہی مہر بھی جگ میں کہیں وفا بھی ہی

زبان شکوہ سو اب زمانے میں ہیہات
کوئی کسی ستی ہم دیگر آشنا بھی ہی

ستم روا ہی اسیروں پہ اس قدر صیاد
چمن چمن کہیں بلبل کی اب نوا بھی ہی

(۶)

ٹوٹے تری نگہ سے اگر دل حباب کا
پانی بھی پھر پئیں تو مزہ ہی شراب کا

دوزخ مجھے قبول ہی ای منکر و نکیر
لیکن نہیں دماغ سوال و جواب کا

غافل غضب سے ہو کے کرم پر نہ رکھ نظر
پُر ہی شرار و برق سے دامن سحاب کا

قطرہ گرا تھا جو کہ مرے اشک گرم سے
دریا میں ہی ہنوز پھپھولا حباب کا

ای برق کس طرح سے میں حیران ہوں تجھ کنے
نقشہ ہی ٹھیک دل کے مرے اضطراب کا

زاہد سبھی ہی نعمت حق جو ہی اکل و شرب
لیکن عجب مزہ ہی شراب و کباب کا

سودا نگاہ دیدۂ تحقیق کے حضور
جلوہ ہر ایک ذرہ میں ہی آفتاب کا

(۷)

جوں غنچہ تو چمن میں بند قبا کو کھولے
پھر گل سے اے پیارے بلبل کبھو نہ بولے

آویگا وہ چمن میں تڑکے ہی مے کشی کو
شبنم سے کہہ دے بلبل پیالے گلوں کے دھولے

باغ جہاں میں آکر کچھ ہم نے پھل نہ پایا
اک دل ملا کہ جس میں ہیں سیکڑوں ٹولے

ایسا ہی "جاؤں جاؤں" کرتے ہو تو سدھارو
اس دل پہ کل جو ہوگی سو آج ہی نہ ہولے

کم بولنا ادا ہے ہر چند پر نہ اتنا
مُند جائیں چشم عاشق تو بھی وہ لب نہ کھولے

چشم پُر آب ہوں میں جیوں آئینہ حبابی
رک رک کے پڑ گئے ہیں چھاتی میں سب پھپھولے

کون ایسا ہے کہے یہ سودا گلی میں اس کی
لا تجھکو پیچلوں میں دل کھول کر تو رولے

(٨)

نے بلبل چمن نہ گل نو دمیدہ ہوں
ہیں موسم بہار میں شاخ بریدہ ہوں

گریاں نہ شکل شیشہ و خنداں نہ طرز جام
اس میکدہ کے بیچ عبث آفریدہ ہوں

کوئی جو پوچھتا ہے یہ کس پر ہے داد خواہ
جیوں گل ہزار جا سے گریباں دریدہ ہوں

تیغ نگاہ چشم کا تیرے نہیں حریف
ظالم میں قطرہ قطرہ مژہ خوں چکیدہ ہوں

کس سے کروں میں عقدہ دل جا کے اے خدا
دل دادہ زلف ہوں رخ دلبر نادیدہ ہوں

کرتا ہے جا کے گل کی تسلی چمن میں تو
خون جگر میں ہی تو دامن کشیدہ ہوں

غافل ہے کیوں اتری وقت سے گوش دل
اے بے خبر میں نالہ حلق بریدہ ہوں

میں کیا کہوں کہ کون ہوں سودا بقول درد

جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں

(۵)

خانہ بردر چمن ہیں آج ہی صیاد ہم
اتنی فرصت دے کہ ہو لیں گل سے بھی آزاد ہم

خندۂ گل بے نمک فریاد بلبل بے اثر
آہ اس گلشن سے جا کر کیا کریں گے یاد ہم

خاکساروں سے موافق کب ہے دنیا کی ہوا
راہ میں تیری گئے جیوں نقش پا برباد ہم

ذبح تو کرتا ہے ٹک فرصت گلے لگنے کی دے
عید قرباں کی تجھے دے لیں مبارکباد ہم

جب سے مجنوں کیا اپنے قدم کے فیض سے
خانۂ زنجیر رکھتے ہیں سدا آباد ہم

نکل سکتے اسیری سے تری ای سرو قد
طوق قمری کی طرح رکھتے ہیں زاد ہم

ای جنوں ہر عہد ترا سودا کا ہے زنجیر پا
قید سے تیری نہیں ہوتے کبھی آزاد ہم

۲

(۳) خواجہ میر درد (۱۷۸۵ء)

خواجہ محمد میر دہلوی۔ غزل میں تصوف اور معرفت کے پاکیزہ مضامین نظم فرماتے تھے اکثر چھوٹی چھوٹی بحروں میں طبع آزمائی کرتے تھے کلام میں سنجیدگی اور متانت کا لحاظ رکھتے تھے فارسی کے عارفانہ خیالات کو اُردو زبان کا لباس پہنانے میں اُنھوں نے جو صفائی اور سادگی برتی ہے وہ اُن کے دیوان اُردو سے بخوبی ظاہر ہوتی ہے دہلی کے اُجڑ جانے پر اکثر شریف خاندان ترک…

اپنے وطن کو خیرباد کہنی شروع کر دی تھی مگر توکل اور قناعت نے انھیں دہلی سے باہر نہ جانے دیا اور اپنے سجّادے پر بیٹھے رہے خواجہ صاحب نے ۳ جنوری ۱۷۸۵ء مطابق ۱۱۹۹ھ کو انتقال فرمایا۔

غزل (۱۰)

ہم نے کس رات نالہ سر نہ کیا
پر اسے آہ نے اثر نہ کیا

کتنے بندوں کو جان سے کھویا
کچھ خدا کا بھی تو نے ڈر نہ کیا

دیکھتے کو رہے ترستے ہم
نہ کیا رحم تو نے پر نہ کیا

آپ سے ہم گذر گئے کب کے
کیا ہے ظاہر میں گو سفر نہ کیا

کونسا دل ہے وہ کہ جس میں آہ!
خانہ آباد تو نے گھر نہ کیا

کیوں بھواں تانتے ہو بندہ نواز
سینہ کس وقت میں سپر نہ کیا

سب کے جوہر نظر میں آئے درد
بے ہنر تو نے کچھ ہنر نہ کیا

(۱۱)

اگر یوں ہی یہ دل ستاتا رہیگا
تو اک دن مرا جی ہی جاتا رہیگا

میں جاتا ہوں دل کو ترے پاس چھوڑے
مری یاد تجھ کوں دلاتا رہیگا

گلی سے تری دل کو لے تو چلا ہوں
میں پہونچوں گا جب تک یہ آتا رہیگا

جفا سے غرض امتحانِ وفا ہے
تو کہہ کب تلک آزماتا رہیگا

قفس میں کوئی تم سے ای ہم صفیرو
خبر گل کی ہم کو سناتا رہیگا

خفا ہو کے ای دردِ مرتو چلا تو
کہاں تک غم اپنا چھپاتا رہیگا

(۱۲)

وہ دن کدھر گئے کہ ہمیں بھی فراغ تھا
یعنی کبھو تو اپنے بھی دل کا دماغ تھا

جلتا ہے اب پڑا خس و خاشاک میں ملا
وہ گل کہ ایک عمر چمن کا چراغ تھا

گذرے ہوں جب خرابی پہ کہتے ہیں وے لوگ
ہے کوئی دن کی بات یہ گھر تھا یہ باغ تھا

(۱۳)

نہ مطلب ہے گدائی سے نہ یہ خواہش کہ شاہی ہو
الٰہی ہووہی جو کچھ کہ مرضیِ الٰہی ہو

نگینے کے سوا کوئی بھی ایسا کام کرتا ہے
کہ ہو نام اور کا روشن اور اپنی روسیاہی ہو

نہیں شکوہ مجھے کچھ بے وفائی کا تری ہرگز
گلہ تب ہو اگر تو نے کسی سے بھی نباہی ہو

(۱۴)

سرسبز تھا نیستاں تیرے ہی اشکِ غم سے
تھے سیکڑوں ہی نالے وابستہ ایک دم سے

واقف نہ یاں کسو سے ہم ہیں نہ کوئی ہم سے
یعنی کہ آگئے ہیں بہکے ہوئے عدم سے

ہیں گو نہیں ازل سے پرتا ابد ہوں باقی
میرا حدوث آخر جا ہی بجز قدم سے

گر چاہیے تو ملیے اور چاہیے نہ ملیے
سب تجھ سے ہو سکے ہے ممکن نہیں تو ہم سے

مشتاق گر ترا کچھ لکھے تو کیا عجب ہے
ہوں مثل نرگس آنکھیں پیدا ابھی قلم سے

ہر چند یہ تمنا در خور نہیں ہمارے
نزدیک تو جو آوے کیا دور ہے کرم سے

اب ہیں کہاں وہ نالے سرگشتگی کدھر ہے
تھیں رفتہ پانشاط بیت میرے ہی دم قدم سے

ہے اک نگاہ کافی گو ہووے گاہ گاہے
چنداں نہیں ہے مطلب عاشق کو بیش و کم سے

کاہے کو ہوتی ہم کو گردش نصیب طالع
گر پاؤں اپنا باہر رکھتے نہ ہم عدم سے

آتے ہیں دام میں کب خورشید رو کسو کے
اے شیخ یہ نہیں ہیں تسبیح کے شمسے

ہے درد پر کبھی کچھ تو بری ہی سی مصیبت
گھبرے ہے اور ہی غم چھوٹے جو ایک غم سے

(۱۵) رباعیات

ہم نے بھی کبھی جام و سبو دیکھا تھا
جو کچھ کہ نہیں ہے رو برو دیکھا تھا
ان باتوں کو اب جو غور کرتے ہیں حسنؔ
کچھ خواب سا تھا کہ وہ کبھو دیکھا تھا

(۱۶)

کس کا کون! کیا کسو سے کہنا
اپنا اپنا ہر ایک کا ہے لہنا
گزرے ہے اب اس طرح سے اپنی اوقات
رونا چپکے پڑے اکیلے رہنا

(۴) حسنؔ (سنہ ۱۷۸۶ء)

میر غلام حسن خلف غلام حسین ضاحک۔ بزرگوں کا اصلی وطن ہرات ہے کہ

دہلی میں پیدا ہوئے۔ قدیم وضع کے بزرگ تھے آپ نے ابتدا میں میرزا رفیع سودا سے اصلاح لی اس کے بعد خواجہ میر درد سے استفادۂ سخن حاصل کیا اور سب سے آخر میں ضیاء الدین ضیا دہلوی کے شاگرد ہوئے دہلی چھوڑنے کے بعد آپ نے فیض آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی اور وہاں نواب سردار جنگ کے مصاحبوں میں داخل ہو گئے تھے یوں تو میر حسن جملہ اصناف سخن پر قادر تھے۔ مگر مثنوی بدر منیر آپ کے کمال شاعری کا بے نظیر نمونہ ہے جس میں جذبات انسانی کی تصویر کچھ ایسے طریقے سے کھینچی گئی ہے کہ زمانۂ حاضرہ میں بھی وہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے کہنے کو تو بدر منیر ایک فرضی قصہ نظم کیا ہے لیکن اس میں قدرت کے مناظر انسانی فطرت کی بولتی چالتی تصاویر۔ غم و رنج کے جذبات۔ شادی اور حسرت کے کوائف کو جس خوبی سے دکھایا ہے اُس کی متقدمین اور متاخرین میں مثال نہیں ملتی آصف الدولہ نے اس مثنوی کے صلے میں ایک قیمتی دوشالہ عطا فرمایا میر حسن نے سنہ ١٢٠١ھ مطابق ١٧٨٦ء میں وفات پائی مثنوی کا انتخاب یہ ہے۔

(١٧) غم ہجر

بدن کو جو دیکھا تو زار و نزار ۔۔۔ کسی کو کوئی دیوے جیسے فشار
زباں پر رہیں باتیں وے والہٰی اس ۔۔۔ پراگندہ حیرت سے ہوش و حواس
نہ منہ کی خبر اور نہ تن کی خبر ۔۔۔ نہ سر کی خبر نے بدن کی خبر
اگر سر کھلا ہے تو کچھ غم نہیں ۔۔۔ جو چیر گر گئی ہے پیلی تو محرم نہیں
جو ہستی ہے دو دن کی تو ہو وہی ۔۔۔ جو کنگھی نہیں کی تو یونہی سہی

محرم سنہ ١٢٠١ھ (حسب تذکرہ شعرائے اردو مصنفہ مولوی کریم الدین مطبوعہ سنہ ١٨٤٨ء)

جو سینہ کھلا ہی تو دل چاک ہی | غم آلودہ صبحِ طرب ناک ہی
نہ منظور سرمہ نہ کاجل سے کام | نظر میں وہی تیرہ بختی کی شام
ولیکن یہ خوبوں کا دیکھا سبھاو | کہ بگڑے سے دونا ہو ان کا بناو
جو ماتھے پہ چینِ جبیں غم سے ہی | تو وہ بھی ہی اک موج دریائے مے
وہ آنکھیں جو روتی ہیں بس پھوٹ پھوٹ | تو گویا کہ موتی بھرے کوٹ کوٹ
گریباں سینہ پہ جو ہی کھلا | تو گویا ہی وہ صبحِ عشرت فزا
نقاہت سے چہرہ اگر زرد ہی | ویا آہ ہونٹوں پہ کچھ سرد ہی
اداسے نہیں یہ بھی عالم جدا | کہ ہی چاندنی اور ٹھنڈی ہوا

(۱۸) خوابگاہ

وہ پھولوں کی خوشبو وہ ستھرا پلنگ | جوانی کی نیند اور وہ سونے کا رنگ
سراسر ادیچے زری باف کے | کہ تھے رشکِ آئینۂ صاف کے
کھنچی چادر اک اس پہ شبنم کی صاف | کہ ہو چاندنی جس صفا کا غلاف
کسے اس پہ کسنے وہ منقش کے | کہ جھبوں میں تھے جن کے موتی ٹکے
دھرے اس پہ تکیے کئی نرم نرم | کہ مخمل کو ہو جس کے دیکھے سے شرم

(۱۹) شوخیِ رفتار

عجب چال سے وہ چلے نازنیں | کہ مستی میں پاؤں کہیں کا کہیں
بندھا سر پہ جوڑا اپڑی زرد شال | کمر کی لچک اور ٹھسک کی وہ چال

چلی واں سے دامن اُٹھاتی ہوئی ۔۔۔ کڑے سے کڑے کو بجاتی ہوئی
عجب ایک عالم تھا بے ساختہ ۔۔۔ کہ عالم کا تھا اُس سے دل باختہ

(۵) قایم ۱۷۹۴ء

شیخ محمد قایم نام تھا قصبہ چاند پور ضلع بجنور روہیل کھنڈ کے رہنے والے تھے ابتدا میں خواجہ میر درد سے مشورۂ سخن رکھتے تھے پھر میرزا رفیع سودا کے شاگرد ہوئے ان کا شمار ریختہ کے استادوں میں ہی سلاست اور صفائی ان کا حصّہ تھی ان کے بعض اشعار ضرب المثل کے درجہ تک پہونچ گئے ہیں مثلاً ؎

درد دل کچھ کہا نہیں جاتا
آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا

اپنے وطن میں ۱۲۰۸ھ مطابق ۱۷۹۴ء میں انتقال کیا ایک مکمل دیوان چھوڑا کوئی صنف کلام ایسی نہیں ہی جو اس دیوان میں نہ ہو لیکن دیوان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہی کہ غزل اور مثنوی سے اس شاعر کی طبیعت کو بہت لگاؤ رہا ہی ان کا دیوان ہنوز طبع نہیں ہوا عرصہ ہوا ایک انتخاب مولانا حسرت نے شایع کیا تھا اور دوسرا انتخاب ممتاز اشعار کے نام سے نواب عماد الملک بہادر بلگرامی نے ترتیب دیا ہی جو مدرا س یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہی۔

غزل (۲۰)

مجھ سا کوئی جہان میں آشفتہ سر نہیں ۔۔۔ ہی یوں تو زلف یار بھی پر اس قدر نہیں

ساقی تو شب کی وسعت درازی معاف کر
ظالم قسم ہے مجھ سے مجھے کچھ خبر نہیں

یا رب خلش سے آہ کی ہو جو نہ بہرہ مند
جس دل کا تکیہ گاہ سر نیشتر نہیں

جوں اشک ایک لغزش پا میں گئے ہیں پار
ہستی سے تا بہ نیستی چنداں سفر نہیں

بندہ ہوں بیخودی کا میں اُس مست کی جسے
آشوب روز حشر سے اصلا خبر نہیں

(۳۰)

ایک جا گھر یہ نہیں ہے مجھے آرام کہیں
ہے عجب حال مرا صبح کہیں شام کہیں

اُس کمر سے نگہ شوق لپٹی تو ہے لیک
جی یہ دھڑکے ہے کہ آجائے نہ الزام کہیں

تم نے کی دل کی طلب ہم نے کہا دینگے ولیک
یوں یہ فرمائشیں ہوتی ہیں سرانجام کہیں

پائے دیوار سے پھر میری طرح وہ نہ اُٹھا
جن نے دیکھا تجھے اک بار سر بام کہیں

عذر تقصیر بھی چاہونگا میں اس سے ہے دل
ٹک تو خاموش ہو دینے سے وہ دشنام کہیں

عزم کعبہ کا تو فنا ہم نے کیا ہے لیکن
رہتی کچھ نہ وہاں جامۂ احرام کہیں

(۲۱)

کہہ پیر شیخ و گاہ مرید مغاں رہے
اب تک تو آبرو سے کبھی تو جہاں رہے

صبر و قرار و ہوش دل و دیں تو وال ہے
اے ہم نشیں یہ کہہ تو بھلا ہم کہاں رہے

دنیا میں ہم رہے تو کئی دن پر اس طرح
دشمن کے گھر میں جیسے کوئی میہماں رہے

اے دیدہ دل کو روتے ہو کیا تم ہمیں تو یاں
پیچھے بکنا پڑا ہے کسی طرح جاں رہے

قسمت تو دیکھ بار بھی اپنا گرا تو واں	جس دشت پُرخطر میں کئی کارواں رہے
پیارے ہمیشہ ایک سی رنجش ہی سمجھ بھی ہے لطف	ناخوش کبھی ہوئے تو کبھی مہرباں رہے

مسجد سے گر تو شیخ نکالا ہمیں تو کیا
قایم وہ مے فروش کی اپنی دکاں رہے

(۶) سوز ۱۷۹۸ء

سید محمد نام تھا قراول پور ضلع شاہجہان آباد کے ساکن۔ ان کے کلام میں ان کے تخلص کا پورا اثر نمایاں ہے یعنی ان کا ہر شعر سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے۔ ۱۷۹۸ء مطابق ۱۲۰۹ھ میں بمقام لکھنؤ انتقال کیا۔

۲۰ غزل

دیکھ دل کو چھیڑ مت ظالم کہیں دکھ جائے گا
ہاں بغیر از قطرۂ خوں اور تو کیا جائے گا

قتل کی نیت تو کر آیا ہے تو کیا دیر ہے
ہاں مگر تو مار کر ظالم بہت پچھتائے گا

پھر بھی کہتا ہوں تجھے آ سوز کو یوں مت ستا
مت ستا ظالم! کہیں تو بھی ستایا جائے گا

(۲۴)

تڑپتی کیوں ہے اے بلبل کمال اتنا تو پیدا کر
کہ تیرا اشک خونیں جا کے پڑے گلزار ہو پیدا

یہاں تک کفر پورا چاہیے گر چاک گلشن ہو
بجائے ہر رگ گل رشتۂ زنار ہو پیدا

قتیل خنجر مژگاں ہوں کیا یہ بھی تعجب ہے
کہ میری خاک سے سبزے کی جا گہ خار ہو پیدا

مسیحائی ہے تیری تیغ میں کیا سوز کو ڈر ہے
جو لاکھوں بار ہوئے قتل لاکھوں بار ہو پیدا

(۲۵)

اگر میں جانتا ہے عشق میں دھڑکا جدائی کا
تو محشر تک نہ لیتا نام ہرگز آشنائی کا

نہ پہونچے آہ و نالہ گوش تک کس سے کہیں اپنا
بیاں ہم کیا کریں طالع کی اپنے نارسائی کا

خدایا کس سے ہم بندے کہاویں سخت مشکل ہے
رکھے ہے ہر صنم اس دہر میں دعوی خدائی کا

خدا کی بندگی کا سوز ہے دعوی تو خلقت کو
ولے دیکھا جسے بندہ ہے اپنی خود نمائی کا

(۷) میر ۱۸۱۰ء

میر محمد تقی اکبر آباد میں پیدا ہوئے دہلی میں تعلیم و تربیت پائی عالی دماغی نازک مزاجی میں یگانۂ روزگار رکھتے اُردو شاعری کے خدائے سخن اور مسلم الثبوت اُستاد مانے جاتے

ہیں کلام گوناگوں جذبات سے لبریز ہے غزل گوئی میں حسن و عشق کے علاوہ اخلاق
فلسفہ حکمت کے مضامین پائے جاتے ہیں اردو غزل میں آپ کا وہ رتبہ ہے جو حضرت
سعدی کا فارسی غزل میں۔ ان کے کلام میں سادگی کے ساتھ وہ درد بھی ہے جو کسی
دوسرے شاعر کے کلام میں شاذ پایا جاتا ہے۔ آخر عمر میں خاک اودھ کی کشش نے
لکھنؤ پہنچا دیا تھا وہیں سو برس کی عمر پاکر ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء میں وفات پائی
پانچ دیوان مطبوعہ موجود ہیں حال میں انجمن ترقی اردو نے کلام میر کا عمدہ انتخاب شائع
کیا ہے جس کے ساتھ مولوی عبدالحق صاحب بی اے سکریٹری انجمن کا بیش بہا مقدمہ
شامل ہے آپ کا تذکرہ نکات الشعرا بھی جس میں اپنے معاصرین کے حالات درج کیے
ہیں طبع ہو چکا ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:-

غزل (۲۶)

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

شرمندہ ترے رخ سے ہے رخسار پری کا
چلتا نہیں کچھ آگے ترے کبک دری کا

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

ہر زخم جگر داور محشر سے ہمارا
انصاف طلب ہے تری بیدادگری کا

اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھو
آئینے کو لپکا ہے پریشاں نظری کا

صد موسم گل ہم کو تہ بال ہی گزرے
مقدور نہ دیکھا کبھو بے بال و پری کا

اس رنگ سے جھمکے ہے پلک پر کہ کہے تو
ٹکڑا ہے ترا اشک عقیقِ جگری کا

کل سیر کیا ہم نے سمندر کو بھی جا کر
تھا دستِ نگر پنجۂ مژگاں کی تری کا

لی سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

ٹک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسا ہے چراغِ سحری کا

(۲۷)

کیا کہوں کیسا ستم غفلت سے مجھ پر ہو گیا
قافلہ جاتا رہا میں صبح ہوتے سو گیا

بیکسی مدت تلک برسا کی اپنی گور پر
جو ہماری خاک پر سے ہو کے گزرا رو گیا

کچھ خطرناکی طریقِ عشق میں پنہاں نہیں
کھپ گیا وہ راہرو اس راہ ہو کر جو گیا

مدعا جو ہے سو وہ پایا نہیں جاتا کہیں
ایک عالم جستجو میں جی کو اپنے کھو گیا

میر ہر یک موج میں ہے زلف ہی کا سا دماغ
جب سے وہ دریا پہ آ کر بال اپنے دھو گیا

(۲۸)

دل عشق کا ہمیشہ حریفِ نبرد تھا
اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے درد تھا

اک گرد راہ تھا پئے محمل تمام راہ
کس کا غبار تھا کہ یہ دنبالہ گرد تھا

دل کی شکستگی نے ڈرائے رکھا ہمیں
واں چیں جبیں پر آئی کہ یاں رنگ زرد تھا

مانند حرفِ صفحۂ ہستی سے اٹھ گیا
دل بھی مرا جریدۂ عالم میں فرد تھا

تھا پشتہ ریگ بادیہ اک وقت کارواں — پھر گرد باد کوئی بیاباں نبرد تھا

گذری مدام اس کی جوانان مست ہیں — پیر مغاں بھی طرفہ کوئی پیر مرد تھا

عاشق ہیں ہم تو میر کے بھی ضبط عشق کی
دل جل گیا تھا اور نفس لب پہ سرد تھا

(۲۹)

جو اس شور سے میر روتا رہیگا — تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہیگا

مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح — تو کب تک مرے منہ کو دھوتا رہیگا

مرے دل نے وہ نالہ پیدا کیا ہے — جرس کے بھی جو ہوش کھوتا رہیگا

ہیں وہ رونے والا چلا ہوں جہاں سے
جسے ابر ہر سال روتا رہیگا

۳۰ قطعہ

کل پاؤں ایک کاسہ سر پر جو آگیا — یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا

کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر — میں بھی کبھو کسو کا سر پر غرور تھا

تھا وہ تو رشک حور بہشتی ہمیں میں میر — سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنے قصور تھا

(۳۱)

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا

دیکھا؟ اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا
عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا
حرف نہیں جاں بخشی میں اُس کی خوبی اپنی قسمت کی
ہم سے جو پہلے کہہ بھیجا سو مرنے کا پیغام کیا
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
سارے رند اوباش جہاں کے تجھ سے سجود میں رہتے ہیں
بانکے ٹیڑھے ترچھے تیکھے سب کا تجھ کو امام کیا
سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی
کوسوں اس کی اور گئے پر سجدہ ہر ہر گام کیا
کس کا کعبہ کیسا کون حرم ہے کیسا احرام
کوچے کے اُس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا
شیخ جو ہے مسجد میں ننگا رات کو تھا میخانے میں
جبہ خرقہ کرتا ٹوپی مستی میں انعام کیا
کاش اب منہ سے برقع اُٹھا دے ورنہ پھر کیا حاصل ہے
آنکھ مندے پر اُن نے گو دیدار کو اپنے عام کیا

یاں کے سفید و سیاہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا

صبح چمن میں اس کو کہیں تکلیف ہوا سے آئی تھی
رُخ سے گل کو مول لیا قامت سے سرو غلام کیا

ساعد سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لا کر چھوڑ دیے
بھولے اُس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا

کام ہوئے ہیں سارے ضائع ہر ساعت کی سماجت سے
استغنا کی چوگنی اُن نے جوں جوں میں ابرام کیا

ایسے آہوئے رم خوردہ کی وحشت کھونی مشکل تھی
سحر کیا اعجاز کیا جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

(۳۱)

پتّا پتّا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

لگنے نہ دے بس ہو تو اس کے گوہر گوش کو بالے تک
اس کو فلک چشمِ مہ و خور کی پتلی کا تارا جانے ہے

آگے اس متکبّر کے ہم خدا خدا کیا کرتے ہیں
کب موجود خدا کو وہ مغرور خود آرا جانے ہے

عاشق سا تو سادہ کوئی اور نہ ہوگا دنیا میں
جی کے زیاں کو عشق میں اس کے اپنا وارا جانے ہے

چارہ گری بیماریٔ دل کی رسمِ شہرِ حسن نہیں
ورنہ دلبرِ ناداں بھی اس درد کا چارا جانے ہے

کیا ہی شکار فریبی پر مغرور ہے وہ صیاد بچہ
طائر اڑتے ہوا میں سارے اپنا اُسارا جانے ہے

مہر و وفا و لطف و عنایت ایک سے واقف ان میں سے
اور تو سب کچھ طنز و کنایہ رمز و اشارا جانے ہے

عاشق تو مردہ ہے ہمیشہ اٹھتا ہے دیکھے سے اُس کے
یار کے آجانے کو یکایک عمر دوبارا جانے ہے

کیا کیا آفتیں سر پر اس کے لاتا ہے معشوق اپنا
جس بیدل بیتاب و تواں کو عشق کا مارا جانے ہے

رخنوں سے دیوارِ چمن کے منہ کو لے ہے چھپا یعنی
ان سوراخوں کے ٹک رہنے کو سو کا نظارا جانے ہے

تشنۂ خوں ہے اپنا کتنا میرؔ بھی ناداں تلخی کش

دم دار آبِ تیغ کو اس کے آبِ گہر کو ادا جانتے ہیں

(۸) جراتؔ سنہ ۱۸۱۰ء

شیخ قلندر بخش دہلوی۔ بذلہ سنج لطیفہ گو معاملہ بند شاعر تھے۔ سلیمان شکوہ نواب اودھ کی ملازمت میں داخل تھے عالمِ شباب میں بینائی جاتی رہی تھی طبیعت کو رنگ تغزل سے خاص مناسبت تھی حسن و عشق کے واقعات اور عاشق و معشوق کے راز و نیاز ان کی شاعری کا جزو اعظم ہیں علمی استعداد کم تھی۔ بلکہ صاحب تذکرہ آبِ حیات نے یہاں تک لکھدیا ہے کہ عربی زبان سے نابلد تھے سنہ ۱۸۱۰ء مطابق سنہ ۱۲۲۲ھ لکھنؤ میں وفات پائی بعض غزلیات میں ایک ہی مضمون لکھا ہے۔ ایک موقع پر اپنے دل سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

(۳۲) غزل

ای دلا ہم ہوئے پابندِ غمِ یار کہ تو
اب اذیت میں بھلا ہم ہیں گرفتار کہ تو

ہم تو کہتے تھے۔ نہ عاشق ہو اب اتنا تو بتا
جا کے ہم روتے ہیں پہروں پسِ دیوار کہ تو

ہاتھ کیوں عشقِ بتاں سے نہ اٹھایا تو نے
کفِ افسوس اب ہم ملتے ہیں ہر بار کہ تو

وہی محفل ہے وہی لوگ وہی ہے چرچا
اب بھلا بیٹھے ہیں ہم شکلِ گنہگار کہ تو

ہم تو کہتے تھے کہ سب نہ لگا ساغرِ عشق
مئے اندوہ سے اب ہم ہوئے سرشار کہ تو

نے جگر جی کا پھنسانا تجھے کیا تھا درکار
طعن و تشنیع کے اب ہم ہیں سزاوار کہ تو

وحشتِ عشق بری ہوتی ہے دیکھا ناداں
ہم چلے دشت کو اب چھوڑ کے گھر بار کہ تو

آتشِ عشق کو سینے میں عبث بھڑکایا
اب بھلا کھینچوں ہوں میں آہِ شرربار کہ تو

ہم تو کہتے تھے نہ ہمراہ کسی کے لگ چل
اب بھلا ہم ہوئے رسوا سرِ بازار کہ تو

غور کیجے تو یہ مشکل ہے زمیں اے جرأت
دیکھیں ہم اس میں کہیں اور بھی اشعار کہ تو

(۳۳)

میرے ہونے سے تو کچھ گرمیِ بازار نہیں
میں ہوں وہ جنس کہ کوئی جس کا خریدار نہیں

دل تو اڑ سے ہی پہ حیرت سے میں کیونکر روؤں
آپ تصویر کو گریہ سے سروکار نہیں

درد کیا جانیے کیا کیا یہ بیاں کرتا یار
دہنِ زخم کو گویا لبِ گفتار نہیں

تیرے بیمار سا بیمار نہ ہوگا کوئی
جس کو ظاہر میں جو دیکھو تو کچھ آزار نہیں

(۳۴)

غیر کو تم نہ آنکھ بھر دیکھو
کیا غضب کرتے ہو ادھر دیکھو

دیکھنا زلف و رخ تمہیں ہر وقت
شام دیکھو نہ تم سحر دیکھو

(۹) مصحفی سنہ ۱۸۱۱ء (تخمیناً)

شیخ غلام ہمدانی امروہہ ضلع مراد آباد کے شیخ زادگان سے تھے عنفوانِ شباب

میں طالب علمی کرنے کو دہلی آئے اور پھر وہیں سکونت اختیار کر لی آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ پہونچے میرزا سلیمان شکوہ کی ملازمت کے زمانہ میں سید انشار سے مقابلے ہوئے کسی کے شاگرد نہ تھے مگر زبان میں سودا اور میر کی پیروی کرتے تھے فارسی میں بھی صاحب دیوان تھے اُردو میں چھ دیوان تصنیف کیے تھے مشکل زمینوں میں عمدہ شعر نکالتے تھے ٹھیک سنہ وفات معلوم نہیں ہوا لیکن یہ مسلم ہے کہ وہ اُنیسویں صدی کے عشرِ اوّل میں زندہ تھے اس لیے ان کو میر اور جرات کے بعد جنھوں نے ۱۸۱۰ء میں وفات پائی ہے جگہہ دی گئی۔

غزل (۳۵)

لافِ خوبی ترے عارض پہ جو گلشن مارے
آتشِ رخ پہ صبا طیش سے دامن مارے

کیا غضب ہے جو تو غرفے میں کھلے بال پھرے
اور نظارہ ترا دیدۂ روزن مارے

ہے یہ خوش حال اُنھوں کا جو ترے کوچے میں
خاک پنڈے کو ملے بیٹھے ہیں آسن مارے

دشمن و دوست کو الفت نے تری ایک کیا
ہاتھ پہ ہاتھ نہ کیوں شیخ و برہمن مارے

ہم ترے واسطے اے غیرتِ لیلیٰ کب تک
قیس کی طرح پڑے پھرتے ہیں بن بن مارے

وہ جو آنکھیں ہیں تری رہزن و خونیں کافر
قافلے لوٹ لیے سیکڑوں رہزن مارے

ضبط سے مصحفی اب کام مرا در گزرا
کب تلک غم میں کسی کے کوئی تن من مارے

گرے جو اُس کی نظر سے تو پھر کہاں کے ہوئے
نہ ہم زمیں کے ہوئے اور نہ آسماں کے ہوئے

قفس سے جھانک ہی لیوینگے گل کو ایکے ہیں
جو رخنے بند نہ دیوارِ گلستاں کے ہوئے

ہی جائے شکر کہ ناکشتنی پہ ہم سے لوگ
تری گلی میں سزاوار امتحاں کے ہوئے

عجب نہیں ہی کہ بلبل کو ہووے نشو و نما
کہ اس ہوا میں ہرے خار آشیاں کے ہوئے

نظر سے ناقۂ لیلیٰ یہ ہو گیا غایب
کہ لوگ ہر طرف آوارہ کارواں کے ہوئے

متاع حسن کے تودے لگے جہاں دیکھے
ہم ایک بار خریدار اُس دکاں کے ہوئے

ہزار شکر کہ ان گلرخوں کی مجلس میں
گئے جو ہم تو یہ شرمندہ برگ پاں کے ہوئے

گلی میں اُس کی جو ہم مر گئے تو بعد مرگ
سگ و ہما میں کئی حصے استخواں کے ہوئے

بلیغ وہ ہر ہزا ای مصحفیؔ تو لاشک و ریب
جو تھے فصیح وہ بندے تری زباں کے ہوئے

(۱۰) انشاؔ ۱۸۱۸ء

سیّد انشاء اللہ خاں۔ دہلوی۔ نواب سعادت علی خاں بادشاہ اودھ کی مصاحبت میں داخل تھے ان کی جامعیت اور علمی قابلیت کم نہ تھی مگر لکھنؤ کا رنگ دیکھ کر ظرافت پر اُتر آئے تھے پھر بھی ان کے کلام میں جدّت اور انداز بیان کا خاص لطف پایا جاتا ہی اُردو زبان میں سب سے پہلے صرف ونحو کے قواعد منضبط کیے۔ دریائے لطافت جس کی زبان فارسی ہی ان کی مصنّفہ ہی اپنے رنگ کی پہلی کتاب ہی جس میں عروض معانی و بیان سب کچھ موجود ہی یہ کتاب حال میں انجمن ترقی اُردو کے زیر نگرانی اُردو میں شایع ہوئی ہی حضرت انشاء کا کلیات علم ادب کا عجائب خانہ ہی جس میں دیوان ریختہ۔ دیوان ریختی پہیلیاں۔ طلسمات کے نسخے پشتو کے قواعد۔ مثنویات گرمی کی شکایت۔ بھڑوں۔ کھٹملوں پسوؤں کے بیانات حکایتیں معمّے چیستاں شامل ہیں جو ان کی خداداد ذہانت اور علمی قابلیت کا ثبوت پیش کرتی ہیں کوئی ایسا رنگ نہیں جو کلام میں موجود نہ ہو سنہ ۱۲۳۰ھ مطابق سنہ ۱۸۱۵ء میں وفات پائی۔

(۳۶) غزل

مجھے رونا آتا ہی شمع سحر پر	اکہ بیچاری اب مستعد ہی سفر ہی

اجی! کیوں رُلاتے ہو مجھکو تمہیں کیا	نہیں رحم آتا مری چشم تر پر
یہی وضع ہے تو مجھے کھوئے گا	پڑے پھریئے گا ہاتھ رکھے کمر پر
اجی جی میں ہے اب کہیں بیٹھ رہیئے	بس اک باندھ تکیہ کسی رہگذر پر
جنوں سے اگر آشنائی ہوئی تو	مطوّل کو دے مار تو مختصر پر

کچھ اک صاف صاف ایسے لکھ شعر انشا
کہ وہ ماریں چشمک صفا سے گہر پر

(۳۷)

کمر باندھے ہوئے چلنے پہ یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں
خیال اُن کا پرے ہے عرش اعظم سے کہیں ساقی
غرض کچھ اور دھن ہیں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں
بسان نقش پائے رہروان کوئے تمنا میں
نہیں اُٹھنے کی طاقت کیا کہیں لاچار بیٹھے ہیں
یہ اپنی چال ہے اُفتادگی سے ان دنوں پہروں
نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں

کہیں ہیں صبر کس کو آہ ! ننگ و نام کیا شے ہے
غرض رو پیٹ کر ان سب کو ہم اک بار بیٹھے ہیں

نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو
جسے پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں

نئی یہ وضع شرمانے کی سیکھی آج ہے تم نے
ہمارے پاس صاحب ورنہ یوں سو بار بیٹھے ہیں

کہاں گردش فلک کی چین دیتی ہے بھلا انشا
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

(۳۸)

مجھے کیوں نہ آوے ساقی نظر آفتاب الٹا
کہ پڑا ہے آج خم میں قدح شراب الٹا

عجب الٹے ملک کے ہیں اجی آپ بھی کہ تم سے
کبھی بات کی جو سیدھی تو ملا جواب الٹا

چلے تھے حرم کو رہ میں ہوئے اک صنم کے عاشق
نہ ہوا ثواب حاصل یہ ملا عذاب الٹا

یہ شب گزشتہ دیکھا وہ خفا سے کچھ ہیں گویا
کہیں حق کرے کہ ہووے یہ ہمارا خواب الٹا

ابھی جھڑ لگا دے بارش کوئی مست بڑھ کے نعرہ
جو زمیں پہ پھینک مارے قدح شراب الٹا

یہ عجیب ماجرا ہے کہ بروز عید قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

ہوئے وعدے پہ جو جھوٹے تو نہیں ملا کے تیور
ای لو دیکھو سمجھ تماشا یہ سنو عتاب الٹا

کھڑے چپ ہو دیکھتے کیا مرے دل اجڑ گئے کو
وہ گنہ تو کہہ دو کس سے یہ ہوا خراب الٹا

غزل اور قافیوں میں نہ کہے تو کیونکہ انشا
کہ ہوا نے خود بخود آ۔ ورقِ کتاب اُلٹا

(۱۱) نظیر ۱۸۳۰ء

ولی محمد اکبرآبادی بزرگوں کا اصلی وطن شاہجہان آباد تھا دہلی کی تباہی اور بربادی کے بعد اکبرآباد آئے اور محلہ تاج گنج کے قریب سکونت اختیار کی معلمی کا پیشہ کرتے تھے شاعری میں وہ کسی کے شاگرد نہ تھے ان کے کلام میں قدرت کے مناظر کی جھلک پائی جاتی ہے۔ ہندوستان کے میلوں ٹھیلوں، آزاد فقیروں کے مجمعوں، پرتکلف مجالس اور بے تکلف ٹولیوں میں ان کی نظموں کو مزے لے کر پڑھا جاتا ہے روزمرہ کے محاورات ہر موقع و محل کی اصطلاحات صاف اور سیدھی زبان میں لکھتے تھے۔ یہ روایت بھی مشہور ہے کہ شاہ اودھ نے ان کو معقول تنخواہ دینے کا وعدہ کیا تھا اور لکھنؤ بلایا تھا مگر آگرہ کے حدود سے باہر نہ نکلے۔ ۱۶ اگست ۱۸۳۰ء مطابق ۲۴ صفر ۱۲۴۶ھ کو آگرہ میں انتقال کیا تاج گنج میں دفن ہوئے کلیات نظیر قدیم کے علاوہ اس کا ایک جدید ایڈیشن اعلیٰ پیمانہ پر نولکشور پریس لکھنؤ نے شایع کیا ہے اور پروفیسر شہباز نے ان کی مبسوط سوانح عمری جس میں کلام پر تنقید بھی کی گئی ہے زندگانی بے نظیر کے نام سے لکھی ہے جو مطبع مذکور میں چھپی ہے کلام کا انتخاب یہ ہے۔

(۳۹)

برسات کا تماشا

سانون کی کالی راتیں اور برق کے اشارے
جگنوں چمکتے پھرتے جوں آسماں پہ تارے
لپٹے گلے سے سوتے معشوق ماہ پارے
گرتی ہی چھپت کسی کی کوئی کھڑا پکارے

آ یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

باتوں میں ہر اک کے پھولوں کی لال چھڑیاں
بجلی چمکتی پھرتی اور لگ رہی ہیں جھڑیاں
گل بوندوں کے جا و پر بوندیں ہیں مینہ کی جھڑیاں
برسیں ہیں یا ہزاروں اب موتیوں کی لڑیاں

آ یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

(۴۰) تاج گنج

یارو جو تاج گنج یہاں آشکار ہے
مشہور اس کا نام بہ شہر و دیار ہے
خوبی میں سب طرح کا اسے اعتبار ہے
روضہ جو اس مکان میں دریا کنار ہے
ایسا چمک رہا ہے تجلی سے یہ مکاں
جس سے بلور کی بھی چمک شرمسار ہے
ایسا ہلال اس میں سنہرا ہے دل پسند
ہر بار جس کے خم پہ مہ نو نثار ہے

تعریف اس مکاں کی میں کیا کیا کروں نظیر
اس کی صفت تو مشتہر روزگار ہے

۴۹

بنجارے نامہ

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارہ
کیا بدھیا بھینسا بیل شتر کیا گوئیں پلا سر بھارا
کیا گیہوں چانول موٹھ مٹر کیا آگ دھواں اور انگارا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاویگا جب لاد چلیگا بنجارا

گر تو ہی لکھی بنجارا اور کھیپ بھی تیری بھاری ہے
ای غافل تجھسے بھی چڑھتا اک اور بڑا بیوپاری ہے
کیا شکر مصری قند گری کیا سانبھر میٹھا کھاری ہے
کیا داکھ منقے سونٹھ مرچ کیا کیسر لونگ سپاری ہے
سب ٹھاٹھ پڑا رہجاویگا جب لاد چلیگا بنجارا

تو بدھیا لادے بیل بھرے جو پورب پچھم جاویگا
یا سود بڑھا کر لاویگا یا ٹوٹا گھاٹا پاوے گا
قزاق اجل کا رستے میں جب بھالا مار گراویگا
دھن دولت ناتی پوتا کیا اک کنبہ کام نہ آویگا
سب ٹھاٹھ پڑا رہجاویگا جب لاد چلیگا بنجارا

ہر منزل میں اب ساتھ ترے یہ جتنا ڈیرا ڈانڈا ہے
زر دام درم کا بھانڈا ہے بندوق سپر اور کھانڈا ہے
جب نایک تن کا نکل گیا جو ملکوں ملکوں ہانڈا ہے
پھر ہانڈا ہے نہ بھانڈا ہے نہ حلوا ہے نہ مانڈا ہے
سب ٹھاٹھ پڑا رہجاویگا جب لاد چلیگا بنجارا

جب چلتے چلتے رستے میں یہ گون تری ڈھل جاوگی
اک بدھیا تیری مٹی پر پھر گھاس نہ چرنے پاویگی
یہ کھیپ جو تونے لادی ہے سب حصوں میں بٹ جاویگی
دھی پوت جنوائی بیٹا کیا بنجارن پاس نہ آویگی
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاویگا جب لاد چلیگا بنجارا

یہ کھیپ بھرے جو جاتا ہی یہ کھیپ میاں مت گن اپنی
اب کوئی گھڑی پل ساعت میں یہ کھیپ بدن کی ہی کفنی
کیا تھال کٹوری چاندی کی کیا پیتل کی ڈبیا ڈھکنی
کیا برتن سونے چاندی کے کیا مٹی کی ہنڈیا چینی کی
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاویگا جب لاد چلیگا بنجارا

یہ دھوم دھڑکا ساتھ لیے کیوں پھرتا ہی جنگل جنگل
اک تنکا ساتھ نہ جاویگا موقوف ہوا جب ان اور جل
گھر بار اٹاری چوپاری کیا خاصہ نین سکھ اور ململ
کیا چلون پردے فرش نئے کیا لال پلنگ اور رنگ محل
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاویگا جب لاد چلیگا بنجارا

کچھ کام نہ آویگا تیرے یہ لعل و زمرد سیم و زر
جب پونجی باٹ میں بکھریگی ہر آن بنیگی جان اوپر
نوبت نقارے بان نشان دولت حشمت فوجیں لشکر
کیا مسند تکیہ ملک مکاں کیا چوکی کرسی تخت چھپر
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاویگا جب لاد چلیگا بنجارا

کیوں جی پر بوجھ اٹھاتا ہی ان گونوں بھاری بھاری کے
جب موت کا ڈیرا آن پڑا پھر دونے ہیں بیوپاری کے
کیا ساز جڑاؤ زر زیور کیا گوٹے تھان کناری کے
کیا گھوڑے زین سنہری کے کیا ہاتھی لعل عماری کے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاویگا جب لاد چلیگا بنجارا

مغرور نہ ہو تلواروں پر مت پھول بھروسے ڈھالوں کے
سب پٹا توڑ کے بھاگینگے منہ دیکھ اجل کے بھالوں کے
کیا ڈبے موتی ہیروں کے کیا ڈھیر خزانے مالوں کے
کیا بقچے تاش مشجر کے کیا تختے شال دوشالوں کے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاویگا جب لاد چلیگا بنجارا

کیا سخت مکاں بنواتا ہی خم تیرے تن کا ہی پولا
تو اونچے کوٹ اٹھاتا ہی واں گور گڑھے نے منہ کھولا
کیا رینی خندق رند بڑے کیا برج کنگورا انمولا
گڑھ کوٹ رہکلہ توپ قلعہ کیا شیشہ دارو اور گولا

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

ہرن لومڑی اور لوٹے ہیں کہیں مرتا پھرتا ہے بن بن
ٹک غافل دل سے سوچ ذرا ہے ساتھ لگا تیرے دشمن
کیا لونڈی باندی دائی دا کیا بندہ چیلا نیک چلن
کیا مندر مسجد تال کنواں کیا کھیتی باڑی پھول چمن

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

جب مرگ پھرا کر چابک کو یہ بیل بدن کا ہانکے گا
کوئی ناج سمیٹے گا تیرا کوئی گون سئے اور ٹانکے گا
ہو ڈھیر اکیلا جنگل میں تو خاک لحد کی پھانکے گا
اس جنگل میں پھر آہ نظیر اک تنکا آن نہ جھانکے گا

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

(۱۲) ناسخ ۱۸۳۸ء

شیخ امام بخش نام تھا اصلی وطن لاہور تھا فیض آباد میں تعلیم پائی تھی فارسی کے ماہر تھے اردو زبان کی تراش خراش اور بندشوں کی چستی اور تعقیدات کا دور کرنا یہ سب ان کی ایجاد ہیں انھوں نے اردو شاعری کو نیا جامہ پہنا دیا تھا اُن کے اعلیٰ ترین پایۂ تحقیق اور اُن کی استادی مسلم ہے۔ انھوں نے اپنے کلام میں دیگر شعرائے لکھنؤ کی طرح مبالغہ اور تشبیہات سے بہت کام لیا ہے لیکن اس کو اس طرح نباہا ہے کہ اس سے کلام کا زور گھٹنے نہیں پایا یہ ان کی استادی پر دال ہے۔ ۷۴-۷۵ برس کی عمر پا کر ۱۲۵۴ھ ۱۸۳۸ء میں دنیا کو خیر باد کہی۔ کلیات ناسخ مطبوعہ خاص و عام ہے۔

غزل (۴۲)

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا
طلوع صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا

کسی خورشید رو کو جذب دل نے آج کھینچا ہے
کہ نور صبح صادق ہے غبار اپنے بیاباں کا

شفق سمجھا ہے اس کو ایک عالم نے بیدادی
فلک پر گر بگولا جا لگا خاک شہیداں کا

سیہ خانہ مرا روشن ہوا ویران ہونے سے
کیا دیوار کے رخنوں نے یاں عالم چراغاں کا

وہ شوخ فتنہ انگیز اپنی آنکھوں میں سمایا ہے
کہ اک گوشہ ہے صحرائے قیامت جس کے داماں کا

کفن کی جیب سفیدی کو تکتا ہوں کنج مرقد میں
تو عالم یاد آتا ہے شب مہتاب ہجراں کا

مرا ویرانہ مثل آئینہ معمور حیرت ہے
یقین ہر رخنۂ دیوار سے ہے چشم حیراں کا

کسی سے دل نہ اس وحشت سرا میں میں نے اٹکایا
نہ الجھا خار سے دامن کبھی میرے بیاباں کا

تہ شمشیر قاتل کس قدر بشاش تھا ناسخ
کہ عالم ہر دہان زخم پر ہے روئے خنداں کا

(۴۳)

یہ نور ہے روئے مہ جبیں کا۔ کہ ہو تجلی چاند چودھویں کا
جو حلقہ ہے زلف عنبریں کا۔ وہ ایک نافہ ہے مشک چیں کا
یہ اس کی ہے ساعدوں کا عالم۔ کہ جس نے دیکھے ہوا وہ بے دم

نیامِ تیغ قضائے مبرم ۔ لقب ہی قاتل کی آستیں کا

یہ جوش پہیاں ہی اشک کا ہم ۔ کہ ساتوں دریا ہیں قطرے سے کم

جسے کہ کہتے ہیں سب جہنم شرر ہی اک آہِ آتشیں کا

بُرا ہو بدبخت عاشقی کا ۔ نہ دیں ہو برباد یوں کسی کا

بنا ہی عشق بتاں میں ٹیکا ۔ نشانِ سجدہ مری جبیں کا

طمع ہی انصاف دوستاں سے کہ اتنا فرمائیں سب یہاں سے

کیا ہی ناسخ نے آسماں سے ۔ بلند تر رتبہ اس زمیں کا

(۱۳) شہیدی ۱۸۴۰ء

منشی کرامت علی خاں ولد عبدالرسول خاں عروضی موضع دائرہ پور وہ ضلع اناؤ کے باشندے تھے شاعری میں مصحفی اور نصیر دہلوی کے شاگرد تھے فقیرانہ لباس میں عرصۂ دراز تک بریلی میں رہے تھے ۔ ان کا نعتیہ و عاشقانہ کلام مستانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہی دیوان طبع ہو چکا ہی ۱۲۵۵ھ میں جب وقت مدینۂ منورہ میں داخل ہوئے اور روضۂ مبارک کو دیکھا تو فرط اشتیاق میں آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی اور یہ شعر مقبول ہو گیا ؎

تمنّا ہی کہ وہ اڑ کے تیرے روضے پہ جا بیٹھے

قفس جس وقت ٹوٹے طائر روحِ مقید کا

روضۂ رسول پر جان دی

غزل (۴۴)

سنگ گر سینے میں اس کے عوضِ دل ہوتا
کارِ عشاق نہ اس مرتبہ مشکل ہوتا

گھر سے جب سیر کو صحرا کے نکلتی لیلیٰ
نجد کے رخ پہ اٹھا پردۂ محمل ہوتا

بیٹھ جاتا لبِ فرش آکے اگر ایک گدا
اس میں نقصان ترا کیا صاحبِ محفل ہوتا

دل میں ارماں ہی رہا سیرِ چمن کا اس رنگ
کہ مرے ساتھ وہ زیبندہ شمائل ہوتا

اس کی بدّھی کے لیے پھول میں چنتا پھرتا
ہاتھ اس کا مری گردن میں حمائل ہوتا

عام ہیں اس کے تو الطاف شہیدی سب پر
تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

(۴۵)

غضب ہے جس بتِ کافر پہ اپنا دم نکلتا ہے
نیا تابوت اس کے کوچے سے ہر دم نکلتا ہے

نہ رکھ آنکھوں پہ میری آستینِ لطف اے ہمدم
کہ اشکِ سرخ کے ہمراہ دل کا غم نکلتا ہے

دکھا کر اپنی آرائش پری مجھکو نہ دھوکا دے
کسی کے سادہ پن میں ہی عالم نکلتا ہے

وہ کب خاطر میں لاتا ہے مرے آزردہ ہونے کو
سمجھ رکھا ہے ظالم نے پھنسا دل کم نکلتا ہے

سمجھ کر اجنبی میں جس سے دل کا راز کہتا ہوں
خجل ہوتا ہوں کیا کیا جب ترا محرم نکلتا ہے

بنا دیتا ہے کوچہ فقر کا بڈھے کو بھی سیدھا
کھنچا جب جنتری میں تار کا سب خم نکلتا ہے

شہیدی سے نہیں واقف مگر اتنا تو واقف ہیں

کہ راتوں کو کوئی کرتا ہوا ماتم نکلتا ہے

(۱۴) میر ممنون ۱۸۴۴ء

میر نظام الدین سید قمر الدین خاں منت دہلوی کے بیٹے اور شاگرد تھے انھوں نے اکبر شاہ ثانی کا عہد پایا تھا۔ ان کے دیوان میں اس بادشاہ کی مدح میں قصائد موجود ہیں ایک قصیدہ میں جو بادشاہ کے حضور میں پیش ہوا تھا اپنے والد اور استاد کا ذکر اس طرح کیا ہے ؎

تیرے حضور میں پڑھتا ہوں شعر منت کا
کہ اس پہ ختم ہوئی طرز نکتہ پیرائی

اردو کے علاوہ فارسی زبان میں بھی شعر کہتے تھے اور صاحب دیوان تھے ان کا اردو دیوان خود ان کے قلم کا لکھا ہوا کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن میں موجود ہے آخر زمانہ میں گورنمنٹ انگریزی کی ملازمت اختیار کر لی تھی اجمیر میں عہدہ صدر الصدوری پر ممتاز تھے ۱۸۴۴ء مطابق ۱۲۵۰ھ میں وفات پائی کلام کا نمونہ یہ ہے:-

۴۶ غزل

سرسبز تخمِ دوستی ہووے بغیر دل کہاں مانندِ شمع جل بجھی ہے پہ بزم خالی دیکھ کے	بارے بتا یہ آسماں ایسی زمیں قابل کہاں اس نے نہ پوچھا ایک دن ہے آج وہ بیدل کہاں

بے چین سا ہوں صبح و پگہ کچھ اور تو وقت نہیں
مفتون جی کس پہ ہوا دل ہو گیا مائل کہاں

بحرِ حوادث کا یہ شور بادِ مخالف کا وہ زور
کشتی پھنسی ہی موجوں میں ٹوٹا ہاتھ آئے اب ساحل کہاں

بختِ سیہ کا مرتبہ ثابت دکھیو اک نقطہ ولا
اُس سے قضا نے وہم کے رخ پر بنایا تل کہاں

تاریک شب ہے پُر خطر کوئی نہ یار و راہبر
دیکھیں کہ ہم نے پاؤں سر کرتے ہیں اب منزل کہاں

مدت سے ہم ہیں در قفس اے ہم صفیرو کیا خبر
غنچے کدھر کو ہیں اُگے گل رہ گئے ہیں کھل کہاں

سو بار ہم نے ہے کہہ چکا خوبوں سے مت مل ہے بُرا
لیکن سمجھتا ہی بھلا اپنا دلِ جاہل کہاں

شیشہ بھی ہے ساقی بھی ہے شمع بھی پر بن ترے
وہ خوبیٔ مجلس کہاں وہ رونقِ محفل کہاں۔

کچھ عقدۂ مشکل کا تو ممنون اندیشہ نہ کر
مشکل کشا جب سر پہ ہو رہتی ہی پھر مشکل کہاں

(۱۵) آتش ۱۸۴۷ء

آتش۔ خواجہ حیدر علی ولد خواجہ علی بخش دہلوی ۱۷۶۷ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ وہیں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ ان کے والد نے لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ خواجہ صاحب رند مشرب، آزاد مزاج، شوخ طبع شاعر تھے۔ فنِ سخن میں شیخ غلام ہمدانی مصحفی سے تلمذ حاصل تھا۔ شیخ ناسخ کے ہمعصر تھے۔ سلاستِ زبان اور صفائی کلام نے لکھنؤ میں اُن کی جادو بیانی کے ڈنکے بجا دیئے تھے۔ غزل میں حسن و عشق کے علاوہ اخلاقی مضامین

بھی لکھتے تھے ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء میں انتقال کیا۔ کلیات آتش جس میں دو دیوان ہیں ہر جگہ دستیاب ہوتا ہی۔ نمونہ کلام یہ ہی:۔

۴۷ غزل

حسنِ پری اک جلوۂ مستانہ ہی اُس کا
ہشیار وہی ہی کہ جو دیوانہ ہی اُس کا

گل آتے ہیں ہستی میں عدم سے ہمہ تن گوش
بلبل کا یہ نالہ نہیں افسانہ ہی اُس کا

جو چشم کہ حیراں ہوئی آئینہ ہی اُس کی
جو سینہ کہ صد چاک ہوا شانہ ہی اُس کا

وہ یاد ہی اُس کی۔ کہ بھلا دے دو جہاں کو
حالت کو کرے غیر وہ یارانہ ہی اُس کا

یوسف نہیں جو ہاتھ لگے چند درم سے
قیمت جو دو عالم کی ہی بیعانہ ہی اُس کا

آوارگیٔ نکہتِ گل۔ ہی یہ اشارہ
جامے سے جو باہر ہی وہ دیوانہ ہی اُس کا

شکرانۂ ساقیٔ ازل کرتا ہی آتش
لبریز مئ شوق سے پیمانہ ہی اُس کا

(۴۸)

خارِ مطلوب جو ہووے تو گلستاں مانگوں
بجلی گرنے کو جو چاہے تو باراں مانگوں

خاک میں بھی جو ملوں میں۔ تو کسی صحرا میں
تم سے مٹی بھی نہ اے گبر و مسلماں مانگوں

بادشاہی سے فقیری کا ہی پایا بالا
بوریا چھوڑ کے کیا تختِ سلیماں مانگوں

نج سے عشق کے ہر راحتِ دنیا بار تر
زخم خنداں ہو اگر ہیں گلِ خنداں مانگوں

یاس وحرماں ہیں جو لوہے کے چنے بھی تو چباؤں
نعمتِ عشق کے قابل لبِ دنداں مانگوں

ملتی ہو مانگنے سے باغ جہاں میں جو مراد
گل سے بلبل کے کفن کے لیے داماں مانگوں

جامۂ جسم سے رکنے کا نہیں ست جنوں
پیرہن خاک میں دیوانۂ عریاں مانگوں

بختِ واژوں نے زباں کو یہ اثر بخشا ہے
تلخیِ مرگ مزہ دے جو نمکداں مانگوں

کب سے در پر ترے سائل ہوں آتش کی طرح
وہ ملے مجھ کو جو کچھ ای شہِ خوباں مانگوں

(۱۶) گویا ۱۸۵۰ء

نواب فقیر محمد خاں گویا واحد علی شاہ بادشاہ اودھ کا زمانہ پایا تھا صاحبِ دیوان تھے ان کا دیوان ۱۲۴۲ھ میں مرتب ہو چکا تھا لیکن اس کے طبع کی نوبت ان کی وفات کے بعد آئی سب سے پہلی مرتبہ اس کو ۱۸۸۵ء میں مطبع نولکشور نے کانپور میں چھاپا تھا۔ ۱۸۵۰ء مطابق ۱۲۶۶ھ میں انتقال ہوا غزل کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

غزل (۴۹)

پھر یہ دل شیفتۂ زلفِ پریشاں ہوگا
پھر مرا جوشِ جنوں سلسلہ جنباں ہوگا

اے جنوں پھر مجھے خوش آنے لگی عریانی
پھر نہ دامن ہی رہیگا نہ گریباں ہوگا

پھر بہار آئی ہوا جوشِ جنوں پھر مجھ کو
چاک پھر گل کی روش میرا گریباں ہوگا

پھر ہوا شوقِ شہادت مجھے پھر ہونگا شہید
پھر گلا میرا تہِ خنجرِ بُرّاں ہوگا

پھر لگی لالہ رخوں سے مجھے الفت ہونے
سینہ پھر داغوں سے مانندِ گلستاں ہوگا

پھر جلینگے ترا قد دیکھ کے گلزاروں میں
پھر ہر اک سرو چمن سروِ چراغاں ہوگا

پھر ترے قد کا خیال آنے لگا گلشن میں
نخلِ ماتم مجھے پھر سروِ گلستاں ہوگا

پھر کسی آئینہ رخسار سے الفت ہوگی
صورتِ آئینہ پھر دل مرا حیراں ہوگا

چاہ پھر تیری جھنکلے کی کنوئیں اے یوسف
پھر یہ دل شیفتۂ چاہِ زنخداں ہوگا

پھر لکھوں گا تری رفتار کی خط میں تعریف
نامہ پھر میرا یہ کبکِ خراماں ہوگا

گھر میں دل پھر مرا گھبرانے لگا آپسے آپ
اے جنوں پھر یہ مکاں خانۂ زنداں ہوگا

پھر ہوا عشق ترے ناوکِ مژگاں سے مجھے
پھر عوض دل کے مرے سینہ میں پیکاں ہوگا

یاد پھر یار کی تڑپائے گی بجلی کی طرح
ابر پھر ساتھ مرے راتوں کو گریاں ہوگا

پھر مرے نالوں سے ہوجائیگا محشر برپا
چاک پھر صبحِ قیامت کا گریباں ہوگا

پھر خوش آتی ہے مرے دل کو شبِ ماہ کی سیر
عشق پھر چاند سے مکھڑے کا بدوچنداں ہوگا

پھر ہوا جوشِ جنوں جاؤنگا پھر صحرا کو
پھر ہر اک آبلے میں خارِ مغیلاں ہوگا

مجھ سے پھر مرنے پہ خوش چشم کرینگے کاوش
سبزہ پھر قبر کا پامالِ غزالاں ہوگا

پھر طبیعت مری آنے لگی اک کافر پہ
پھر نہ دل ہوگا نہ دیں ہوگا نہ ایماں ہوگا

پھر مزہ عشق کا چکھیں گے مرے زخمِ جگر | ہاتھ میں پھر مرے قاتل کے نمکداں ہوگا

ان دنوں پھر مجھے گویا ہے چٹکی سی لگی
پھر ارادہ طرفِ ملکِ خموشاں ہوگا

(۱۷) مومن ۱۸۵۲ء

حکیم مومن خاں ولد حکیم غلام نبی خاں دہلوی خاندانی شریف اور طبیب تھے
ان کے اسلاف کشمیر سے دہلی آئے تھے اور شاہ عالم کے عہد میں موضع بلاہہ پرگنہ
نارنول (پنجاب) میں انھیں جاگیر عطا ہوئی تھی ۱۲۱۵ھ میں پیدا ہوئے شاہ نصیر کے
شاگرد تھے مگر تھوڑے دنوں بعد انھیں اپنا کلام دکھانا چھوڑ دیا اور ایسی مشق
سخن بڑھائی کہ خود استاد ہو گئے۔ وارفتہ طبیعت عاشق مزاج آدمی تھے۔
نازک طبع عالی خیال تھے غزل کے علاوہ قصائد میں بھی ان کا خاص رنگ تھا
اور مثنوی میں تو وہ رنگ اختیار کیا ہے جو بے مثل ہے ان کا تخیل اعلیٰ درجہ کا ہے
غالب کے کلام کی طرح ان کا کلام بھی ابھی پرانا نہیں ہوا جب پڑھیے نیا لطف آتا ہے
۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۲ء کو کوٹھے سے گر کر ۳۵ سال کی عمر میں جوان فوت ہوئے دیوان
موجود ہے

(۵۰) قطعہ

وہ نوجوان عابد و زاہد کہ سب جسے | کہتے تھے مومن اور بہشت دیدار رکھتا تھا

کل ایسے حال سے نظر آیا کہ کیا کہوں
جو تھا سو اُس کو دیکھ کے زار و نزار تھا

عبرت کی جا ہے اُن صنموں نے کیا خراب
ملنے سے جن کے معتقدِ ننگ و عار تھا

بیمار کر دیا تپِ ہجراں سے آہ
کیا ہو گئے وہ روز کہ پرہیزگار تھا

یا تو ہمیں ڈراتے تھے خورشیدِ حشر سے
یا اپنے سر پہ داغِ جنوں شعلہ بار تھا

اختر شماریِ شبِ غم نے بھلا دیا
جتنا خیالِ پرسشِ روزِ شمار تھا

ہر ایک کی طرف نگہ بے کسانہ تھی
کس کی نگاہِ لطف کا اُمیدوار تھا

ہمّت نہ سے اور نہ ناز اُٹھانے کی آرزو
باقی تھی گو کہ ضعف سے جینا بھی بار تھا

ہر دم ہوائے آہ سے اُڑتی تھی منہ پہ خاک
جانتی کہ سر میں گرد تھی دل میں غبار تھا

زخموں میں بسکہ مشک بھرا تھا میں کیا کہوں
عالم بدن کا اُن کے عجب لالہ زار تھا

غزل (۵۱)

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ جو لطف مجھ پہ تھا پیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے یاد ہے وہ ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دم بدم

گلۂ ملامتِ اقربا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کوئی بات ایسی اگر ہوئی کہ تمہارے جی کو بری لگے

تو بیان سے پہلے ہی بھولنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم میں بھی راہ تھی کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی

کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

سنو ذکر ہے کئی سال کا کہ کیا اک آپ نے وعدہ تھا

سو نباہنے کا تو ذکر کیا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کہا بات میں نے وہ کوٹھے کی ترے دل سے صاف اتر گئی

تو کہا کہ جانے مری بلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ بگڑنا وصل کی رات کا وہ نہ ماننا کسی بات کا

وہ نہیں نہیں کی ہر آن ادا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے آپ گنتے تھے یا خدا جسے آپ کہتے تھے با وفا

میں وہی ہوں **مومن** مبتلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

(۵۲)

دفن جب گور میں ہم سوختہ ساماں ہوں گے	فلسِ ماہی کے گل شمع شبستاں ہوں گے

ناوک انداز جدھر دیدۂ جاناں ہوں گے
نیم بسمل کئی ہوں گے کئی بے جاں ہوں گے

تاب نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم تو کل خواب عدم میں شب ہجراں ہوں گے

ناصحا دل میں تو اتنا تو سمجھ اپنے کہ ہم
لاکھ ناداں ہوئے کیا تجھ سے بھی ناداں ہوں گے

کر کے زخمی مجھے نادم ہوں یہ ممکن ہی نہیں
گر وہ ہوں گے بھی تو بے وقت پشیماں ہوں گے

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنہیں چاہ کے ارماں ہوں گے

ہم نکالیں گے سن اے موج ہوا بل تیرا
اس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہوں گے

صبر یارب مری وحشت کا پڑے گا کہ نہیں
چارہ فرما بھی کبھی قیدی زنداں ہوں گے

منت حضرت عیسیٰ نہ اٹھائیں گے کبھی
زندگی کے لیے شرمندۂ احساں ہوں گے

تیرے دل تفتہ کی تربت پہ عدو جھوٹا ہے
گل نہ ہوں گے شرر آتش سوزاں ہوں گے

غور سے دیکھتے ہیں طوف کو آہوئے حرم
کیا کہیں اس کے سگ کوچہ کے قرباں ہوں گے

داغ دل نکلیں گے تربت سے مری جوں لالہ
یہ وہ اخگر نہیں جو خاک میں پنہاں ہوں گے

چاک پردہ سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشیں
ایک میں کیا کہ سبھی چاک گریباں ہوں گے

پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہوگی
پھر وہی پاؤں وہی خار مغیلاں ہوں گے

سنگ اور ہاتھ وہی وہ ہی سر و داغ جنوں
وہی ہم ہوں گے وہی دشت و بیاباں ہوں گے

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

(۱۸) تسکین ۱۸۵۲ء

میر حسین ولد میر حسن عرف میرن صاحب ان کا سلسلۂ نسب میر حیدر رفاں تک پہونچتا ہے جو حسین علی وزیر فرخ سیر کا قاتل تھا حضرت تسکین ۱۲۱۸ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے فارسی مولوی امام بخش صاحب صہبائی دہلوی سے پڑھی ابتدا میں شاہ نصیر دہلوی کو اپنا کلام دکھاتے رہے پھر حکیم مومن خاں صاحب مومن دہلوی کے زمرۂ تلامذہ میں داخل ہوگئے معاش کی تلاش میں کچھ دنوں تک لکھنؤ میرٹھ وغیرہ قیام رہا پھر رام پور میں ملازم ہوگئے اور ۱۲۶۸ھ میں وہیں انتقال کیا پچاس سال کی عمر پائی انھوں نے شاہ نصیر مرحوم کا دیوان ترتیب دیکر اردو کی ادبی دنیا پر بڑا احسان کیا ہے۔ ترکیب بندش اور میدان تخیل میں اپنے اُستاد کے نقشِ قدم پر چلتے تھے ان کا دیوان نایاب ہے کلام یہ ہے۔

(۵۳) غزل

کر سکے دفن نہ اُس کوچے میں احباب مجھے
خاک میں دل کی کدورت نے دیا داب مجھے

ہجر میں پاس نہ ہے زہر نہ خنجر افسوس!
نہ دیئے مرنے کے بھی چرخ نے اسباب مجھے

قاصد آیا ہے وہاں سے تو ذرا تھم تو سہی
بات تو کرنے دے اُس سے دلِ بیتاب مجھے

نامِ تسکیں پہ یہ مضمون تپش نازیبا
تھا تخلص جو سزاوار تو بے تاب مجھے

(۱۹) وزیر سنہ ۱۸۵۴ء

خواجہ محمد وزیر لکھنوی خلف خواجہ محمد فقیر۔ آپ خواجہ بہاء الدین نقشبندی کی اولاد میں سے تھے حضرت ناسخ کے تلامذہ میں نامور تھے۔ کلام میں حسن و عشق کے ساتھ اخلاق اور تصوف کی چاشنی موجود ہے سب سے پہلے آپ کا دیوان سنہ ۱۲[illegible]ھ میں مطبع مصطفائی لکھنؤ نے چھاپا تھا اس کے بعد دوسری جگہ طبع ہوا عام طور پر بازار میں ملتا ہے۔ ذی قعدہ سنہ ۱۲۷۰ھ میں وفات پائی۔ خواجہ صاحب کی یہ غزل زبان زد خلائق ہے۔

غزل ۵۴

چلا ہے او دلِ راحت طلب کیا شادماں ہو کر
زمینِ کوئے جاناں رنج دیگی آسماں ہو کر

یہی باعث تو قتلِ عاشقاں کو منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو یوسفِ بے کارواں ہو کر

کیا غیروں کو قتل اُس نے موئے ہم رشک کے مارے
اجل بھی دوستوں آئی نصیبِ دشمناں ہو کر

بناوٹ نے بگاڑا بات میں سنوائیں خموشی نے
نہ پوچھو ہم نے کیا ہی منہ کی کھائی بے زباں ہو کر

وہ پیاسا ہوں لگا کر تیغِ ترآب اُس نے جب کھینچی
نکل آئی وہاں زخم سے سوکھی زباں ہو کر

ادا سے جھک کے ملتے ہو نگہ سے قتل کرتے ہو
ستم ایجاد ہو ناوک لگاتے ہو کماں ہو کر

جوابِ نامہ کیا لایا تنِ بیجاں میں جاں آئی
گیا یاں سے کبوتر واں سے آیا مرغِ جاں ہو کر

کہیں گر زندہ در گور ای ہو تو یہ اب وہ تو زیبا ہے
کیا ہے ہیں نے پیدا سنگ مرقد سخت جاں ہو کر

(۲۰) ذوق سنہ ۱۸۵۵ع

شیخ محمد ابراہیم ولد شیخ محمد رمضان دہلوی ۱۱ ذی الحجہ سنہ ۱۲۰۴ھ کو پیدا ہوئے شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ اکبر شاہ ثانی بادشاہ دہلی نے ۱۹ سال کی عمر میں خاقانی ہند کا خطاب دیکر اپنے دربار کا ملک الشعرا بنا دیا۔ ابوظفر بہادر شاہ ولیعہدی کے زمانہ میں ہی ان کے شاگرد ہو گئے تھے کلام میں عاشقانہ معاملہ بندی اور رندانہ مضامین کی شوخی کی نسبت متانت زیادہ ہے۔ زبان کی صفائی محاورہ بندی اور بندشوں کی چستی کا ان کو خاص خیال ہے غزلوں میں مختلف مواقع پر ضرب المثال کو نظم کرنا انھیں کا حصہ ہے ان کے قصائد خاص طور پر ممتاز ہیں۔ ۲۴ صفر سنہ ۱۲۷۱ھ ۱۸۵۵ع کو انتقال کیا۔ پروفیسر آزاد نے لکھا ہے کہ مرنے سے تین گھنٹے قبل یہ شعر تصنیف کیا تھا ؎

کہتے ہیں ذوق آج جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

ان کا ایک مختصر دیوان اردو جسے حافظ غلام رسول ویران نے سنہ ۱۲۷۲ھ میں ترتیب دیا تھا عام طور پر رائج ہے سنہ ۱۸۹۰ع سے کچھ قبل اس دیوان کو بہت سی غزلوں اور مضامین کے اضافہ کے ساتھ پروفیسر آزاد نے ترتیب دیا چھپا ہوئے

شایع ہوا ہے

غزل (۵۵)

کسی بیکس کو ای بیداد گر مارا تو کیا مارا
جو آپ ہی مر رہا ہو اس کو گر مارا تو کیا مارا

نہ مارا آپ کو جو خاک ہو اکسیر بن جاتا
اگر پارے کو ای اکسیر گر مارا تو کیا مارا

بڑے موذی کو مارا نفس امارہ کو گر مارا
نہنگ و اژدہا و شیر نر مارا تو کیا مارا

خطا تو دل کی تھی قابل بہت سی مار کھانے کی
تری زلفوں نے مشکیں باندھ کر مارا تو کیا مارا

نہیں وہ قول کا سچا ہمیشہ قول دے دے کر
جو اس نے ہاتھ میرے ہاتھ پر مارا تو کیا مارا

تفنگ و تیر تو ظاہر نہ تھا کچھ پاس قاتل کے
الٰہی پھر جو دل پر تاک کر مارا تو کیا مارا

ہنسی کے ساتھ یاں رونا ہے مثل قلقل مینا
کسی نے قہقہا ای بے خبر مارا تو کیا مارا

مرے آنسو ہمیشہ ہیں برنگ لعل غرق خوں
جو غوطہ آب میں تو نے گہر مارا تو کیا مارا

جگر دل دونوں پہلوں میں ہیں زخمی اس نے کیا جانے
ادھر مارا تو کیا مارا ادھر مارا تو کیا مارا

دل سنگین خسرو پر بھی ضرب ای کوہکن پہنچا
اگر تیشہ سر کہسار پر مارا تو کیا مارا

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے میں
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

دل بدخواہ میں تھا مارنا یا چشم بد بیں میں
فلک پر ذوق تیر آہ گر مارا تو کیا مارا

آنکھیں ہی تلووں سے وہ ملجائے تو اچھا — ہے حسرتِ پابوس نکل جائے تو اچھا

جو چشم کہ بے نم ہو وہ ہو کور تو بہتر — جو دل کہ ہو بے داغ وہ جلجائے تو اچھا

بیمارِ محبت نے لیا تیرے سنبھالا — لیکن وہ سنبھالے سے سنبھل جائے تو اچھا

ہو تجھ سے عیادت جو نہ بیمار کی اپنے — لینے کو خبر اس کی اجل جائے تو اچھا

کھینچے دلِ انساں کو نہ وہ زلفِ سیہ فام — اژدر کوئی انساں کو نگل جائے تو اچھا

گریہ نہ رکھے میرے تنِ خشک کو غرقاب — لکڑی کی طرح پانی میں گل جائے تو اچھا

تاثیرِ محبت عجب اک حب کا عمل ہے — لیکن یہ عمل یار پہ چل جائے تو اچھا

فرقت سے تری تارِ نفس سینے میں میرے — کانٹا سا کھٹکتا ہے نکل جائے تو اچھا

ہاں کچھ تو ہو حاصل ثمرِ نخلِ محبت — یہ سینہ پھپھولوں سے جو پھل جائے تو اچھا

دل گر کے نظر سے تری اٹھنے کا نہیں پھر — یہ گرنے سے پہلے ہی سنبھل جائے تو اچھا

وہ صبح کو آئے تو کروں باتوں میں دوپہر — اور چاہوں کہ دن تھوڑا سا ڈھل جائے تو اچھا

ڈھل جائے جو دن بھی تو اسی طرح کروں شام — اور پھر کہوں گر آج سے کل جائے تو اچھا

جب کل ہو تو پھر وہی کہوں کل کی طرح سے — گر آج کا دن بھی یونہیں ٹل جائے تو اچھا

القصہ نہیں چاہتا میں جائے یہاں سے — دل اس کا یہیں گرچہ بہل جائے تو اچھا

ہے قطعِ رہِ عشق میں اے ذوق ادب شرط

جوں شمع تو اب سر ہی کے بل جائے تو اچھا

(٥٧)

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

ہم سا بھی اب بساط پہ کم ہوگا بد قمار
جو چال ہم چلے وہ بہت ہی بری چلے

بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے
پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

ہو عمر خضر بھی تو ہو معلوم وقت مرگ
ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے

(٥٨)

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے
اُن کا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے

چاہیں گر چارہ جراحت کا محبت والے
بیچیں الماس و نمک سنگ جراحت والے

گئے جنت میں اگر سوز محبت والے
تو یہ جانو رہے دوزخ ہی میں جنت والے

ساقیا ہوں جو صبوحی کی نہ عادت والے
صبح محشر کو بھی اٹھیں نہ ترے متوالے

رہتے جوں شیشۂ ساعت ہیں [illegible] دو دل
نہیں [illegible] کبھی [illegible] دل جو کدورت والے

کس طرح کی ہیں [illegible] تیرے
[illegible] ہیں آثار محبت والے

حرص کے پھیلتے ہیں پاؤں [illegible]
[illegible] بیٹھے [illegible] فراغت والے

ہائے رے حسرت [illegible] کوئی
[illegible] ہیں ہائے [illegible] والے

نہیں جز شمع جا در مری بالین مزار
نہیں جز کثرت پروانہ زیارت والے

نہ سنو گے کبھی شکوہ نہ کرم کی خواہش
دیکھیو تو ہم بھی ہیں کیا صبر و قناعت والے

کیا تماشا ہی کہ نکلی ہے تو اپنا فروغ
جانتے اپنی حقارت کو ہیں شہرت والے

دل سے کچھ کہتا ہوں میں مجھ سے ہے دل کچھ کہتا
دونوں اک حال میں ہیں رنج و مصیبت والے

تو جو آ جائے تو ای درد محبت کی دوا
میرے ہمدرد ہوا ہوں بیمار و نصیحت والے

چھوڑ دیتے ہیں قلم جوں قلم آتشباز
میری شرح تپش دل کی کتابت والے

کبھی افسوس ہی آتا کبھی رونا آتا
دل بیمار کے ہیں وہی عیادت والے

تو مرے حال سے غافل ہی پای غفلت کیش
تیرے انداز تغافل نہیں غفلت والے

ناز ہی گل کو نزاکت پہ چمن میں ای ذوق
اُس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

(۲۱) صبا ۱۸۵۵ء

میر وزیر علی ولد میر بندہ علی لکھنوی خواجہ آتش کے ممتاز شاگردوں میں تھے عاشقانہ رنگ میں مزیدار شعر لکھتے تھے آپ کا دیوان چھپ چکا ہے۔ ان کو حضرت واجد علی شاہ کے یہاں سے دوسو روپیہ ماہوار ملا کرتے تھے ۱۲۷۱ھ میں گھوڑے سے گر کر انتقال کیا۔

ای صبا جذبِ چمن دم دلِ ناشاد آیا
میرے آغوش میں اڑ کر وہ پری زاد آیا

دل میں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانیے کیا یاد آیا

بن گیا خالِ جبیں کوکبِ بختِ خورشید
کس ترقی پہ ترا حسنِ خداداد آیا

(۵۹)

شورِ حسن کا ہی وہ عشقِ جنوں زا دل میں
بڑھ گیا ہی نمکین حسن کا سودا دل میں

بات بھی آپ کے آگے نہ زباں سے نکلی
لیجیے آے تھے ہم سوچ کے کیا کیا دل میں

عرصۂ حشر میں ہوگا گزری کا عالم
لے نہ جانا کہیں دنیا کا بکھیڑا دل میں

چھا گیا جیسے بڑھ کر چمنِ ہستی پر
نخلِ الفت کا لگا یا تھا ذرا سا دل میں

ای صبا جس کے لیے ہوں میں پریشاں خاطر
جانتا ہی وہ مجھے گیسوؤں والا دل میں

(۶۰)

مغتنم ہی باغِ عالم کی ہوا دو چار دن
صورتِ گل ہی یہاں نشو و نما دو چار دن

سبزۂ خط کا نمو ہی چاند سے رخسار پر
اور رخ پہ چھوڑ تو زلفِ دوتا دو چار دن

اوبتِ کافری اللہ رے بے پروائیاں — آشنا دو چار دن نا آشنا دو چار دن
مدعائے وصل سن کر وہ صنم کہنے لگا — بیٹھ کر مسجد میں کر یادِ خدا دو چار دن
مجھ گریباں چاک کے مرنے سے یا وحشت ہی — وا رہے اس شوخ کی بندِ قبا دو چار دن
روز آتی ہی لبِ گورِ غریباں سے صدا — شادی و غم ہی پئے شاہ و گدا دو چار دن
نکہتِ گل پھر کہاں باد بہاری پھر کہاں — باندھ لے اے باغباں اپنی ہوا دو چار دن
وام پیدا کیجئے جی ہو چکی مفلس ہوئے — بیٹھیے مسجد میں بنکر پارسا دو چار دن

بادۂ گلگوں چلے ہر روز چل کر باغ میں
موسم گل کے یہی ہیں اے صبا دو چار دن

(۴۳) رند ۱۸۵۷ء

نواب سید محمد خاں۔ فرزند نواب سراج الدولہ غیاث الدین محمد خاں بہادر نصرت جنگ نیشاپوری ان کے والد پہلے فیض آباد میں رہتے تھے۔ پھر لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ رند ۱۱ ربیع الاول ۱۲۱۲ھ کو فیض آباد میں پیدا ہوئے جب تک وہاں رہے اپنا کلام میر مستحسن خلیق والد میر انیس کو دکھایا۔ لکھنؤ میں آکر آتش کے شاگرد ہو گئے۔ اردو شاعری میں قفس۔ صیاد۔ آب و دانہ گرفتاری وغیرہ کے مضامین ان کا حصہ ہی۔ ۱۸۵۷ء میں زندہ تھے۔ غدر سے کچھ دنوں قبل

انتقال کیا۔ دیوان ہر جگہ ملتا ہی یہ غزل زبان زد خاص و عام ہی۔

غزل (۶۱)

کھلی ہی کنجِ قفس میں مری زباں صیاد
میں ماجرائے چمن کیا کروں بیاں صیاد

اُجاڑا موسم گل ہی میں آشیاں میرا
الٰہی ٹوٹ پڑے تجھ پہ آسماں صیاد

اُداس دیکھ کے مجھکو چمن دکھاتا ہی
کئی برس میں ہوا ہی مزاجداں صیاد

دکھایا کُنجِ قفس مجھکو آب و دانہ نے
وگرنہ دام کہاں میں کہاں۔ کہاں صیاد

پروں کو کھول دے ظالم جو بند کرتا ہی
قفس کو لیکے میں اُڑجاؤنگا کہاں صیاد

الٰہی دیکھیے کیونکر نباہ ہوتا ہی
زباں دراز ہوں میں اور بے زباں صیاد

رہے نہ قابلِ پرواز بال و پر میرے
قفس سے اُڑکے میں اب جاؤنگا کہاں صیاد

قفس پہ رکھنے لگا انبو ہار پھولوں کے
ہزار شکر ہوا مجھ پہ مہرباں صیاد

فریب دانہ نہ کھاتا میں زینہار ای زند
نہ کرتا دام اگر خاک میں نہاں صیاد

(۶۲)

جو رہا آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا
سب سے بیگانہ ہی ای دوست شناسا تیرا

شان ارفع ہے تری مرتبہ اعلیٰ تیرا — تو ہے یکتا کوئی ثانی نہیں ہوتا تیرا

ایک عالم کو ترے نام کا ہے ورد اے دوست — میں ہی کچھ ذکر نہیں کرتا ہوں تنہا تیرا

دید لیلیٰ کے لیے دیدۂ مجنوں ہے ضرور — میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تماشا تیرا

جستجو میں جو نہ دوڑیں تری ٹوٹیں وہ پاؤں — سر وہ کٹ جائے نہ ہو جس میں کہ سودا تیرا

تو ہی نے اس کو بنایا ہے ید قدرت سے — تو ہی چاہے گا تو بگڑے گا یہ پتلا تیرا

عاشقِ روئے پری شیفتۂ حور نہیں
جانِ جاں رند ہے دیوانۂ و شیدا تیرا

(۲۳) اختر ۱۸۵۸ء

ملک الشعرا قاضی محمد صادق خاں ولد قاضی محمد لعل ہگلی (ملک بنگال)
کے قاضی زادوں میں تھے مگر علم پرستی اور ذوقِ سخن نے ان کو وطن چھڑا کر لکھنؤ
رہنے پر مجبور کیا۔ میرزا قتیل کے عقیدت مند شاگرد تھے۔ فارسی، اردو، دونوں
زبانوں میں شعر لکھتے تھے۔ آپ نے ایک تذکرہ آفتاب عالمتاب کے نام سے
مرتب کیا تھا جس میں پانچ ہزار شعرا کا حال اور انتخاب درج تھا۔ غازی الدین
حیدر والیٔ لکھنؤ نے ان کو ملک الشعرا کا خطاب دیا تھا۔ سنہ ۱۲۷۵ھ ۱۸۵۸ء میں وفات پائی۔ ان کی یادگار ہیں
صبح صادق، نور الانشا، محامد حیدریہ، دیوان فارسی، دیوان ریختہ۔

ان کا تذکرہ تذکرۂ آفتاب عالمتاب نایاب ہی۔ آپ کا یہ قطعہ نہایت مشہور ہی

(۶۳) قطعہ

کل بن کے شیخ مجتہدِ عصر سا قیا
دکھلا کے باغ سبز عذاب و ثواب کا

کہنے لگا ز راہِ تبختر مجھے بہ طنز
معلوم ہوگا حشر کو پینا شراب کا

ہم نے کہا کہ یہ تو ہیں ہم خوب جانتے
پر کیا کریں کہ ہی ابھی عالم شباب کا

گستاخی ہو معاف تو اک عرض کیں ہم
کیجے جو آپ مجھکو نہ مورد عتاب کا

تقوی ہمارے آگے ہو جب آپکا درست
اور ہو یقین آپ کے اس اجتناب کا

می ہو وے کنج باغ ہو ساقی ہو ماہوش
اور واں کوئی مخل نہ ہو باعث حجاب کا

گردن میں ہاتھ ڈال کے وہ شوخِ بے حجاب
دے ذائقہ زباں کو دہن کے لعاب کا

کھینچے ہنسی سے پیا ملا کر وہ منہ سے منہ
یہ ریش جس پہ جلوہ ہی رنگ خضاب کا

منت سے یوں کہے کہ ہمارا لہو پیے
گر پی نہ جائے جلد یہ ساغر شراب کا

اُس وقت ہم سلام کریں قبلہ آپ کو
گر کچھ بھی خوف کیجئے روز حساب کا

اور امتحاں بغیر تو یہ آپ کا غلام
قائل نہیں ہی قبلہ کسی شیخ و شاب کا

(۶۴)

عجب ڈھب کی یہ تعمیر خرابآباد ہستی ہی
کہ پستی یاں بلندی ہی بلندی یاں کی پستی ہی

ترددکیوں تمھیں اے ساکنانِ ملکِ ہستی ہے
عدم کی راہ سیدھی ہے بلندی ہے نہ پستی ہے

ہلاک اُس کے ہیں ہم کہ پیروی ہے نفسِ کافر کی
خدا کے گھر میں ہے اے دیکھیے کیا بُت پرستی ہے

حصولِ جاہ کی تدبیر جو ہم لوگ کرتے ہیں
ہماری پست حالی دیکھ کر تقدیر ہنستی ہے

گلوں کا ہے گریباں چاک کس کے جبرِ صرصر سے
صبا مضطر سی ہے اور گھبرائی غنچوں کی ہستی ہے

سمجھ ہر ایک کو ہشیار ہم آئے تھے یاں اخترؔ
بچشمِ غور جو دیکھا تو متوالوں کی بستی ہے

(۲۴) امانت ۱۸۵۹ء

سیّد آغا حسن خلف میر آغا حسین رضوی لکھنوی۔ آپ سید علی رضوی کی اولاد سے تھے سنہ ۱۲۳۱ھ میں حضرت امانت کی ولادت ہوئی فنِ شعر میں دلگیر لکھنوی مشہور مرثیہ گو سے استفادہ حاصل کیا۔ ابتدا میں معمّے اور چیستاں کہنے کا شوق ہوا مگر اس فن میں پورے نہ اُترے تو دیگر اصنافِ سخن کی طرف توجہ فرمائی۔ رعایت لفظی اور ضلع جگت کے عاشق تھے لکھنؤ کی قدیم سوسائٹی صنائع و بدائع کو شاعری کا اعلیٰ جوہر سمجھتی تھی اس میں آپ نے کمال حاصل کر لیا تھا۔ یوں تو آپ صاحبِ دیوان ہیں جملہ اصنافِ سخن پر قادر ہیں مرثیہ گوئی میں بھی اپنی طباعی دکھائی ہے لیکن ان کی اندر سبھا کو اردو لٹریچر میں جو شہرت حاصل ہوئی ہے وہ اپنی

نظیر آپ ہی۔ یہ کہنا ذرا بھی بیجا نہیں کہ آپ نے اُردو زبان میں اس کتاب کو لکھ کر سب سے پہلے ڈرامے کی بنیاد ڈالی ہو اردو متقدمین میں اس نمونہ کی ایک نظم بھی نہیں ملتی حضرت امانت نے ۸ رجمادی الاولی ۱۲۷۵ھ کو وفات پائی دیوان طبع ہو چکا ہی۔

غزل (۶۵)

بھولا ہوں میں عالم کو سرشار اسے کہتے ہیں
مستی سے ہوں غافل ہُشیار اسے کہتے ہیں

کل گھر سے جو وہ نکلا اک شور ہوا برپا
دل بِس گئے عالم کے فنار اسے کہتے ہیں

تصویر کو سکتہ ہی کہتے ہیں اسے نقشہ
آئینے کو حیرت ہی رُخسار اسے کہتے ہیں

اک رشتۂ الفت میں گردن ہی ہزاروں کی
تسبیح اسے کہتے ہیں زنار اسے کہتے ہیں

دل نے شب فرقت میں کیا ساتھ دیا میرا
مونس اسے کہتے ہیں غمخوار اسے کہتے ہیں

اک قطرہ نہیں مے کا میخانہ میں اے ساقی
خم کر دیئے سب خالی میخوار اسے کہتے ہیں

دل ہجر کی شب غش ہو بیدار ہی چشم اپنی
بے ہوش اسے کہتے ہیں ہُشیار اسے کہتے ہیں

خاموش امانت ہی کچھ اُف بھی نہیں کرتا
کیا کیا نہیں اے پیارے اغیار اسے کہتے ہیں

(۲۵) نسیم سنہ ۱۸۶۰ء

منشی دیا شنکر لکھنوی ولد گنگا پرشاد پنڈت کشمیری آپ خواجہ آتش مرحوم کے شاگردوں میں تھے مثنوی گلزار نسیم آپ کی مشہور تصنیف ہی جو ۱۸۳۳ء میں تصنیف کی گئی تھی گو اس کا پلاٹ ہندی کے ایک پرانے قصہ سے لیا گیا ہی مگر ادائے بیان نہایت دلکش ہی چھوٹی بحر اور مختصر الفاظ میں اہم مضامین ادا کیے گئے ہیں حال میں مثنوی گلزار نسیم و میر حسن کے متعلق بابو برج نراین چکبست اور مولوی عبد الحلیم شرر کے درمیان مباحثہ ہوا تھا۔ اس مباحثہ میں دونوں مثنویوں پر فن تنقید کے جوہر دکھائے گئے ہیں اس مثنوی کے علاوہ نسیم کا ایک دیوان بھی ملتا ہی مثنوی کا انتخاب یہ ہی

آوارہ ہونا بکاولی کا تلاش (۹۴) گل میں

گل کا جو الم چمن چمن ہی
یوں بلبل خامہ نعرہ زن ہی

گلچیں نے وہ پھول جب اڑایا
اور غنچۂ صبح کھلکھلایا

وہ سبزۂ باغ خواب آرام
یعنی وہ بکاولی گل اندام

جاگی مرغ سحر کے غل سے
اٹھی نکہت سی فرش گل سے

منہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی
پر آب وہ چشم حوض پائی

دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے
کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے

گھبرائی کہ ہیں؟ کدھر گیا گل
جھنجلائی کہ کون دے گیا جل

ہے ہے مرا پھول لے گیا کون
ہے ہے مجھے خار دے گیا کون

ہاتھ اس پہ اگر پڑا نہیں ہے
بو ہو کے تو پھول اڑا نہیں ہے

نرگس تو دکھا۔ کدھر گیا گل
سوسن تو بتا۔ کدھر گیا گل

سنبل مرا تازیانہ لانا
شمشاد انھیں سولی پر چڑھانا

اپنوں میں سے پھول لے گیا کون
بیگانہ تھا سبزے کے سوا کون

شبنم کے سوا چرانے والا
اوپر کا تھا کون آنے والا

جس کف میں وہ گل ہو داغ ہو جائے
جس گھر میں ہو گل چراغ ہو جائے

گلچیں کا جو ہاے ہاتھ ٹوٹا
غنچے کے بھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا

او خار پڑا نہ تیرا چنگل
مشکیں کس لیں نہ تونے سنبل

او باد صبا ہوا نہ بتلا
خوشبو ہی سنگھا۔ بتا نہ بتلا

بلبل تو چہک اگر خبر ہے
گل تو ہی مہک بتا کدھر ہے

(۳۶) ظفر ۱۸۶۲ء

محمد سراج الدین نام خاندان مغلیہ کے آخری بادشاہ تھے ولی عہدی میں

ابوظفر خطاب تھا بہادر شاہ کے لقب سے اپنے باپ اکبر شاہ ثانی کے جانشین ہوئے
تاریخ پیدائش ۲۴ر اکتوبر ۱۷۷۵ء مطابق ۲۸ر شعبان ۱۱۸۹ھ اور ۲۸ر ستمبر ۱۸۳۷ء مطابق
۲۸ر جمادی الثانی ۱۲۵۳ھ کو تخت پر بیٹھے زمانہ ولی عہدی سے شعر و سخن کا مذاق رکھتے
تھے ابتدا میں شاہ نصیر اور پھر خاقانی ہند ذوق دہلوی کے شاگرد ہوئے علمی
قابلیت کے سوا فطری شاعر تھے غدر ۱۸۵۷ء کا منحوس واقعہ انھیں کے زمانہ میں
جبکہ بادشاہی حکومت صرف دہلی میں ایک محدود رقبہ کے اندر باقی رہ گئی تھی
پیش آیا تھا غدر کے فرو ہونے کے بعد ۱۸۵۸ء میں برٹش گورنمنٹ نے ان کو نظربند
کر کے کلکتہ بھیج دیا تھا وہاں سے رنگون کو منتقل ہوئے اور اپنی عمر کے بقیہ انفاس
وہیں گذار دیئے شاعری کا شغل وہاں بھی جاری رہا سوز و گداز ناکامی و محرومی کی
درد بھری داستانوں کو مختصر الفاظ میں نظم کرنا انھیں کا حصّہ تھا اور ظفر جیسے بدنصیب
تاجدار کے جسے اپنے جلیل القدر اسلاف کی مٹی ہوئی یادگاروں پر آخری نظر حسرت
ڈال کر دہلی سے نکلنا نصیب ہوا ہو جسے گزشتہ اقبال اور جاہ و جلال کے خرابوں
پر گہری نظر ڈالنے کا موقع ملا ہو دماغ سے اس قسم کے خیالات نکلنے کے سوا دوسرے
مضامین کی تراوش کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی انھوں نے چار دیوان چھوڑے
جو مشہور عالم ہیں بمقام رنگون ۷ر نومبر ۱۸۶۲ء ۱۲۷۹ھ کو وفات پائی۔

غزل (٦٧)

جہاں وہ پیمانہ ہی پہلے کبھی آبادیاں گھر تھے
جہاں پھرتے بگولے ہیں اُڑاتے خاک صحرا میں

شغال اب ہیں جہاں رہتے کبھی بستے بشر یاں تھے
کبھی اُڑتی تھی دولت یوں کہ سے سیم پایاں تھے

جہاں سنسان اب جنگل ہوا اور شہر خموشاں ہے
جہاں اب خاک کے پیوند نقش ہائے آتا ہوئے صحرا

کبھی کیا کیا نہ ہنگامے تھے یہاں ای شور و شیون کے
کبھی محو تماشا دیدۂ اہلِ نظر یاں تھے

ظفر اس عالم کا کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے
کہ کیا کیا رنگ اب ہیں اور کیا کیا پیشتر یاں تھے

(۶۸)

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاجِ گدایانہ بنایا ہوتا

اپنا دیوانہ بنایا مجھے ہوتا تو نے
کیوں خرد مند بنایا، نہ بنایا ہوتا

خاکساری کے لیے گرچہ بنایا تھا مجھے
کاش خاکِ درِ جانانہ بنایا ہوتا

نشۂ عشق کا گر ظرف دیا تھا مجھ کو
عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا

دلِ صد چاک بنایا تو بلا سے لیکن
زلفِ مشکیں کا ترے شانہ بنایا ہوتا

صوفیوں کے جو نہ تھا لائقِ صحبت تو مجھے
قابلِ جلسۂ رندانہ بنایا ہوتا

تھا جلانا ہی اگر دوریِ ساقی سے مجھے
تو چراغِ درِ میخانہ بنایا ہوتا

شعلۂ حسن چمن میں نہ دکھایا اس نے
ورنہ بلبل کو بھی پروانہ بنایا ہوتا

روز معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفر
ایسی بستی کو تو ویرانہ بنایا ہوتا

(۶۹)

مری آنکھ بند تھی جب تلک وہ نظر میں نورِ جمال تھا
کھلی آنکھ تو نہ خبر رہی کہ وہ خواب تھا کہ خیال تھا

دلِ بسمل ای بتِ عشوہ گر خوشی عید کی سی ہوئی مجھے
خمِ تیغ تیرا جو سامنے نظر آیا مثلِ ہلال تھا

کہو اس تصورِ یار کو کہوں کیوں نہ خضر خجستہ پے
کہ یہی تو دشتِ فراق میں مجھے رہنمائے وصال تھا

مرے دل میں تھا کہ کہونگا میں جو یہ دل پہ رنج و ملال تھا
وہ جب آگیا مرے سامنے تو نہ رنج تھا نہ ملال تھا

وہ ہمنشے وفا وہ ہی پہ جفا وہاں لطف کیسا وفا کہاں
فقط اپنا وہم و خیال تھا یہ خیال امر محال تھا

پس پردہ حسن کے تری صدا تماشوقِ دید جو بڑھ گیا
مجھے اضطراب کمال تھا یہی وجد تھا یہی حال تھا

ظفر اس سے چھوٹ کے جو جیت کی تو یہ جانا ہم نے کہ واقعی
فقط ایک قید خودی کی تھی نہ قفس تھا کوئی نہ جال تھا

دیا اپنی خودی کو جو ہم نے اُٹھا وہ جو پردہ سا بیچ میں تھا نہ رہا
رہے پردے میں اب نہ وہ پردہ نشین کوئی دوسرا اُس کے سوا نہ رہا

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی بُرائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا

ترے رُخ کے خیال میں کون سے دن اُٹھے مجھ پہ نہ فتنہ روزِ جزا
تری زُلف کے دھیان میں کونسی شب مرے سر پہ ہجوم بلا نہ رہا

ہمیں ساغر و بادہ کے دینے میں کرے دیر جو ساقی تو ہائے غضب
کہ یہ عید نشاط یہ دورِ طرب نہ رہے گا جہاں میں سدا نہ رہا

کئی روز میں آج وہ مہر لقا ہوا میرے جو سامنے جلوہ نما
مجھے صبر و قرار ذرا نہ رہا اُسے پاسِ حجاب و حیا نہ رہا

ترے خنجر و تیغ کی آب رواں ہوئی جبکہ سبیل ستم زدگاں
گئے کتنے ہی قافلے خشک زباں کوئی تشنۂ آبِ بقا نہ رہا

مجھے صاف بتائے نگار اگر تو یہ پوچھوں میں رو رو کے خونِ جگر
ملے پاؤں سے کس کے ہیں دیدۂ تر کفِ پا پہ جو رنگِ حنا نہ رہا

اسے چاہا تھا میں نے کہ روک رکھوں مری جاں بھی جائے تو جانے نہ دوں

سے گئے لاکھ فریب کروڑ فسوں نہ رہا نہ۔ رہانہ بہانہ رہا
لگے یوں تو ہزاروں ہی تیر ستم کہ تڑپتے رہے پڑے خاک پہ ہم
و لے ناز و کرشمہ کی تیغ دو دم لگی ایسی کہ تسمہ لگا نہ رہا

ظفرؔ آدمی اس کو نجانیے گا وہ ہو کیسا ہی صاف فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

(۲۷) نسیم دہلوی ۱۸۶۵ء

نواب اصغر علی خاں دہلوی خلف نواب آغا علی خاں۔ آپ مومن دہلوی کے ارشد تلامذہ سے تھے دہلی چھوڑنے کے بعد لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ عربی فارسی میں کافی استعداد تھی فن خوشنویسی میں بھی دستگاہ حاصل تھی۔ آپ کے کلام میں نازک خیالی مضمون آفرینی کے سوا زبان کی خوبیاں اور سادگی کا لطف بھی موجود ہے ۱۲۷۹ھ میں وفات پائی الف لیلہ نظم اور ایک دیوان آپ کی یادگار ہے کلام کا انتخاب یہ ہے

(۷۱) غزل

عروس فکر رنگیں کو خیال آیا جو تزئیں کا
فنگاف خامہ شانہ بن گیا زلف مضامیں کا

بلا قلتی ہی تجشش سے بہا اے چشم تر آنسو
ملے کچھ دامن خالی کو صدقہ روح غمگیں کا

بہار آئی جھکائے سر گلوں نے کیف مستی سے
پڑا ہی گردن ہر شاخ تر میں ہاتھ گلچیں کا

بشکل مرغ بسمل اور بڑھی جاتی ہی بیتابی
دل مضطر کو صدمہ ہو گیا ہی نام تسکیں کا

وہ سر عتا ہی دعا کو مطلب بیتاب نے میرے
کہ برسوں قافلہ ڈھونڈا کیا فریاد آمیں کا

تبسم اب قدردانی اشتیاق سامعیں پر ہر
دکھایا لطف ہم نے ہر طرح سے طبع رنگیں کا

(۷۴)

فصل گل آئی ہی کل اور ہی ساماں ہونگے
میرے دامن میں ترے دست و گریباں ہونگے

سب یہ کافر ہیں حسینوں کی نہ سن تو ای دل
چار دن بعد یہی دشمن ایماں ہونگے

شک ہو جائینگے انجام کو اپنے شک سے
تیغ کے خوف سے ہم ان کے ثناخواں ہونگے

کھینچیے تیغ تامل ہی یہ کیوں بسم اللہ
سر جھکا دینگے جو یاں بندۂ احساں ہونگے

کس طرح جائینگے مانع ہی ہمیں خوف مزاج
زلف پر خم ہی تو پوچھ وہ بھی پریشاں ہونگے

شوخیاں کرلے جنوں آج یہاں پر کل ہم
خاک اڑائے گی زمیں دشت یہ ویراں ہونگے

گریہ انجام تبسم ہی نہ ہنس ای غافل
خوں رلا دینگے وہی زخم جو خنداں ہونگے

یاد آئیگا پس مرگ ہمارا یہ کمال
حال کھل جائیگا جب خاک پہ پنہاں ہونگے

تجھ کو کردینگے خبر زیرِ لحد سونے کی ۔۔۔ سر پٹکتے ترے در پر یہ ارماں ہونگے

خانہ زادوں کو کہاں قیدِ محبت سے فراغ ۔۔۔ ہم وہ بلبل ہیں یہیں خاکِ گلستاں ہونگے

دم نکل جائے گا گر ہاتھ لگا ای جرّاح ۔۔۔ وہ نہیں زخم جو شرمندۂ احساں ہونگے

دورِ ہر نخل کرینگے صفتِ گرد نسیم
ہم پسِ مرگ بھی قربانِ گلستاں ہونگے

(۲۸) انیس ۱۸۶۵ء

میر ببر علی خلف میر مستحسن خلیق۔ میر حسن مصنف مثنوی سحر البیان کے پوتے تھے بزرگوں کا اصلی وطن دہلی تھا۔ مگر میر صاحب نے لکھنؤ میں تعلیم و تربیت حاصل کی ان کے مراثی نے اُردو زبان میں رزمیہ نظم کی کمی کو پورا کر دیا۔ اخلاقی جذبات و اعلیٰ خیالات نے اُن کی شاعری کا مرتبہ بلند کر دیا ہی۔ میرزا دبیر مرحوم ان کے ہمعصر تھے۔ دونوں باکمالوں نے اُردو نظم کی تاریخ میں ایک ایسا ہنگامہ برپا کر دیا تھا کہ "معنی یابی اور الفاظ پرستی" کی جنگ کبھی ذرا بھی بیجا نہیں ان کے زمانہ میں اُردو ادب کے ترقی خواہوں میں دو فریق پیدا ہو گئے تھے جو "انیسیے" اور "دبیریئے" کہلاتے تھے۔ انیس کے ماننے والے نے ساختہ پن۔ آمد۔ سوز و گداز کے شیدائی تھے۔ دبیر کے پیرو شوکت الفاظ۔ مبالغہ۔ صنائع بدائع کو شاعری کا حسن سمجھتے تھے شمس العلما مولانا

شبلی نے ان کے انتقال سے کم و بیش ۳۰ سال کی مدت کے بعد ہمارے زمانہ میں موازنۂ انیس و دبیر لکھ کر اس بحث کو کہ اردو شاعری کی اس خاص صنف میں ان دونوں شاعروں میں سے کس کا پایہ اونچا تھا تازہ کر دیا تھا اور انیس کے حق میں فیصلہ دیا تھا انھوں نے ان اعتراضات کو جو نساخ نے "طومار اغلاط" میں دبیر کے کلام پر کیے ہیں ایک حد تک "تائید" کی تھی لیکن مولوی نظیر حسن صابری نے المیزان شایع کرکے ان دونوں باکمالوں کی بابت اسی منصفانہ رائے کا اظہار کیا ہی جو ہم نے قایم کی ہی۔ مراثی انیس کا مجموعہ چار جلدوں میں نولکشور پریس لکھنؤ نے عرصہ ہوا شایع کر دیا تھا۔ لیکن حال میں نئی ترتیب اور تصحیح کے ساتھ مولانا علی حیدر صاحب طباطبائی نے مراثی انیس کو پانچ جلدوں میں مرتب کیا ہی جس کی پہلی جلد جس میں میر صاحب کی آخری عمر کا کلام ہی نظامی پریس بدایوں سے شایع ہو چکی ہیں۔ ۲۹۔ شوال ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۴ء کو میر صاحب نے انتقال کیا۔ ۷۴ برس کی عمر پائی۔ کلام یہ ہی

صبح (۷۳)

چلنا وہ بادِ صبح کے جھونکوں کا دمبدم	مرغانِ باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
وہ آب و تابِ نہر وہ موجوں کا پیچ و خم	سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور	دیکھو تو غش کرے ارنی گوئے اوج طور

پیدا اگاؤں سے قدرت اللہ کا ظہور | وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خوانِ طیور

گلشن خجل تھے وادیِ مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

ٹھنڈی ہوا وہ سبزۂ صحرا کی وہ لہک | شرمائے جس سے اطلسِ زنگاریِ فلک
وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک | ہر برگِ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ جھلک

ہیرے خجل تھے گوہرِ یکتا نثار تھے
پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

(۶۴)

گرمی کی شدّت

شیر اُٹھتے تھے نہ خوف کے مارے کچھار سے | آہو نہ منہ نکالتے تھے سبزہ زار سے
آئینہ مہر کا تھا مکدّر غبار سے | گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے

گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھُن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

گرداب پر تھا شعلۂ جوّالہ کا گمان | انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں
منہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زبان | تہ میں تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں

پانی تھا آگ گرمیِ روزِ حساب تھی

ماہی جو موج سیخ تک آئی کباب تھی

۶۵ تلوار

بے پاؤں جدھر ہاتھ سے چلتی ہوئی آئی
دم بھر میں وہ سو رنگ بدلتی ہوئی آئی
ندی ادھر اک خون کی ابلتی ہوئی آئی
پی پی کے لہو لعل اگلتی ہوئی آئی
ہیرا تھا بدن رنگ نے مردے سے ہرا تھا
جوہر جو کہو پیٹ جواہر سے بھرا تھا

پہونچی جو سپر تک تو کلائی کو نہ چھوڑا
شوخی کو شرارت کو لڑائی کو نہ چھوڑا
ہر ہاتھ میں ثابت کسی گھائی کو نہ چھوڑا
تیزی کو رکھائی کو صفائی کو نہ چھوڑا
اعضائے بدن قطع ہوئے جاتے تھے سب کے
قینچی سی زباں چلتی تھی فقرے تھے غضب کے

مسافت

دکھ دیتے ہیں ایک ایک قدم پاؤں کے چھالے
ہاتھوں سے اگر بیٹھ کے کانٹوں کو نکالے
منزل پہ پہنچنے کے کبھی پڑ جاتے ہیں لالے
ڈر ہے کہ نہ بڑھ جائیں کہیں قافلے والے
درماندوں کے لینے کو کبھی آتا نہیں کوئی
تھک کر کبھی جو بیٹھے تو اٹھاتا نہیں کوئی

سلام

گنہ کا بوجھ جو گردن پہ ہم اٹھا کے چلے / خدا کے آگے خجالت سے سر جھکا کے چلے

کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی / چلے جو راہ تو چیونٹی کو ہم بچا کے چلے

مقام یوں ہوا اس کارگاہِ دنیا میں / کہ جیسے دن کو مسافر سرا میں آ کے چلے

طلب سے عار ہے اللہ کے فقیروں کو / کبھی جو ہو گیا پھیرا صدا سنا کے چلے

انیس دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لیکے کہاں سامنے ہوا کے چلے

اولاد

دولت کوئی دنیا میں پسر سے نہیں بہتر / راحت کوئی آرام جگر سے نہیں بہتر

لذت کوئی پاکیزہ ثمر سے نہیں بہتر / نکہت کوئی بوئے گلِ تر سے نہیں بہتر

صدموں میں علاجِ دلِ مجروح یہی ہے
ریحاں ہے یہی راح یہی روح یہی ہے

ماں باپ کا دل غنچۂ خنداں ہے اسی سے / گل ہے کہ گھر رشکِ گلستاں ہے اسی سے

سب راحت و آرام کا ساماں ہے اسی سے / آبادیٔ کاشانۂ انساں ہے اسی سے

کس طرح کھلے دل کہ جگر بند نہیں ہے
گھر قبر سے بدتر ہے جو فرزند نہیں ہے

یہ ہی وہ عصا پیر جوان ہوتا ہی جس سے
وہ شمع ہی یہ نور مکان ہوتا ہی جس سے
یہ ہی وہ نگین نام و نشان ہوتا ہی جس سے
وہ دُر ہی قوی رشتۂ جان ہوتا ہی جس سے

کھوتے نہیں یہ مال و زر و مال کے بدلے
موتی بھی لُٹا دیتے ہیں اس لال کے بدلے

صولت یہی شوکت یہی اجلال یہی ہی
سرمایہ یہی نقد یہی مال یہی ہی
ثروت یہی حشمت یہی اقبال یہی ہی
گوہر یہی قوت یہی لال یہی ہی

دلبند ہو پہلو میں تو غم پاس نہیں ہی
کچھ پاس نہیں گر یہ رقم پاس نہیں ہی

ماں باپ کی آسائش و راحت ہی پسر سے
خوں جسم میں آنکھوں میں بصارت ہی پسر سے
تلخی میں بھی جینے کی حلاوت ہی پسر سے
ایام ضعیفی میں بھی طاقت ہی پسر سے

آرام جگر قوت دل راحت جاں ہی
پیری میں یہ طاقت ہی کہ فرزند جواں ہی

وہ شی ہی خوشی در پہ کھڑی رہتی ہی جس سے
وہ لال ہی امید بڑی رہتی ہی جس سے
وہ چیز ہی راحت کی گھڑی رہتی ہی جس سے
وہ دُر ہی یہ دُر جان لڑی رہتی ہی جس سے

آرام و جگر تاب و توان ساتھ ہی اس کے
پھرتا ہی جدھر رشتۂ جاں ساتھ ہی اس کے

(۷۸)
سلام

مرا رازِ دل آشکارا نہیں ۔۔۔ وہ دریا ہوں جس کا کنارا نہیں

وہ گل ہوں جدا سب سے ہی جس کا رنگ ۔۔۔ وہ بو ہوں کہ جو آشکارا نہیں

وہ پانی ہوں شیریں نہیں جس میں شور ۔۔۔ وہ آتش ہوں جس میں شرارا نہیں

بہت زال دنیا نے ویں بازیاں ۔۔۔ میں وہ نوجواں ہوں کہ ہارا نہیں

فقیروں کی مجلس ہی سب سے جدا ۔۔۔ امیروں کا یاں تک گزارا نہیں

سکندر کی خاطر بھی ہی سد باب ۔۔۔ جو دارا بھی ہو تو مدارا نہیں

گئے پہنے نعلین واں مصطفیٰ ۔۔۔ فرشتے کا جس جا گزارا نہیں

جہنم سے ہم نے فراروں کو کیا ۔۔۔ جو آتش پہ ٹھہرے وہ پارا نہیں

پھرے دوست جب ہو گئی قبر بند ۔۔۔ کھلا اب کہ کوئی ہمارا نہیں

ابے ڈگمگا کر زمیں پر حسین ۔۔۔ فرس سے کسی نے اتارا نہیں

ترے صبر کے میں فدا یا حسین ۔۔۔ چھری کے تلے دم بھی مارا نہیں

کسی نے تری طرح سے اے انیس
عروسِ سخن کو سنوارا نہیں

(۲۹) ناظم سنہ ۱۸۶۵ء

نواب محمد یوسف علی خاں فردوس مکان خلف نواب محمد سعید خاں بہادر والی رام پور۔ آپ ۱۳ رجب سنہ ۱۲۷۱ھ کو مسند نشین ہوئے نواب صاحب مرحوم علوم عقلیہ کے ماہر منطق و فلسفہ سے باخبر تھے طبیعت کو شاعری سے خاص طور پر مناسبت تھی۔ پہلے حکیم مومن خاں مومن دہلوی سے مشورۂ سخن رکھتے تھے اس کے بعد میرزا غالب کے شاگرد ہو گئے اسی زمانہ میں عاشقانہ دیوان مرتب ہو کر مطبع حسنی رام پور میں طبع ہوا تھا۔ ۲۱ راپریل سنہ ۱۸۶۵ء مطابق ۲۴ ذی قعدہ سنہ ۱۲۸۲ھ میں وفات پائی انتخاب کلام یہ ہے

دنیا کی بے ثباتی

۷۹

کیا ہوا سرو قدوں؟ اب وہ تمہارا خم و چم

کیا ہوا لالہ رخوں؟ اب وہ تمہارا عالم

کہو کیوں چھوٹ گئی مشق جفا کاری کی

کہو کیوں ٹوٹ گیا سلسلۂ جور و ستم

کھینچتے کیوں نہیں اب میان سے تم خنجر ناز

دیکھتے کیوں نہیں اب تیغ ادا کا دم خم

کچھ نہ عشاق سے مطلب ہی نہ اغیار سے کام
نہ اِدھر چشمِ غضب ہی نہ اُدھر چشمِ کرم

چین کیونکر تمھیں آغوش لحد میں آیا
تم تو آغوشِ تصوّر میں بھی لیتے نہ تھے دم

کیا گزرتی ہی تہِ خاک تمھارے سر پر
فرش پر تم تو نزاکت سے نہ رکھتے تھے قدم

نازنینو، وہ نزاکت کہو کس نے لے لی
سچ بتاؤ تمھیں اپنی ہی نزاکت کی قسم

صحن تک تھا تمھیں دالان سے آنا منزل
کس طرح طی ہوئی راہِ سفرِ ملک عدم

ناز و انداز و ادا۔ عشوے۔ کرشمے۔ غمزے
خاک میں مل گئے سب ہائے ستم ہائے ستم

ہائے وہ ابروے خمدار وہ مژگانِ دراز
ہائے وہ چشمِ فسوں گر کی ادائیں پیہم

ہائے وہ چینِ جبیں شوخی و انداز کے ساتھ
ہائے وہ ناز سے تیور کا بدلنا ہر دم

ہائے وہ شعلۂ رخسار کی غصے میں بھڑک

ہائے وہ گیسوئے پُرپیچ کا ہوتا پُرخم
ہائے وہ فتنہ جگانے کی روش سے چلنا
ہائے وہ چھاگلیں پہنے ہوئے پھرنا چھم چھم
وا دریغا نہ رہی ایک بھی صورت باقی
بہرِ عبرت ہے زبانوں پہ حکایت باقی

(۳۰) رشکؔ ۱۸۶۶ء

میر علی اوسط۔ خلف میر سلیمان۔ آپ فیض آباد کے باشندے تھے شاعری میں حضرت ناسخ لکھنوی کے ارشد تلامذہ سے تھے۔ محاورات کی چھان بین الفاظ کی تحقیقات کا شوق تھا۔ پختہ گو اور محقق مشہور رہیں۔ تاریخ گوئی میں اچھی مہارت بہم پہنچائی تھی۔ صاحب دیوان تھے۔ اب دیوان کمیاب ہے۔ سنہ ۱۲۸۴ھ میں ۸۰ سال کی عمر پاکر انتقال کیا۔ کلام یہ ہے۔

(۸۵) غزل

نہ پنج نوشتہ ہیں قیمہ کیونکر نہ ملے گا	لکھوائینگے نامہ تو کبوتر نہ ملے گا
ہیں رات نقاب اس مہ کامل نے الٹ دی	تاروں کو نشانِ مہ انور نہ ملے گا

ابرِ شبِ فرقت ہی بندھے آنسوؤں کا تار کاہیدگیِ جسم اگر یوں ہی رہیگی	اس طرح کا وقت اے مژۂ تر نہ ملے گا ہم کو بھی ہمارا تنِ لاغر نہ ملے گا

انصاف کو سمجھو خضرِ راہ ہدایت
اے رشک اب ایسا کوئی رہبر نہ ملے گا

(۳۱) آزردہ ۱۸۶۸ء

مفتی صدر الدین خاں صاحب خلف الرشید مولوی لطف اللہ کشمیری مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے شاگرد رشید تھے۔ اپنے زمانہ کے علما اور فضلا میں ممتاز تھے۔ ذوق۔ مومن۔ غالب۔ صہبائی کے ہم عصر اور دوست تھے۔ دہلی میں عہدہ صدر الصدوری کی خدمات ان کے سپرد تھیں۔ جب مفتی صاحب کے اجلاس میں حضرت غالب مرحوم نے یہ شعر بطور جواب دعوے پڑھا کہ ؎

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لاے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

اُنھوں نے شعر سُن کر ان کے قرضہ کا روپیہ اپنی گرہ سے ادا کر دیا۔ آپ نے ایک تذکرۂ شعرائے ریختہ بھی ترتیب دیا تھا۔ جو اس زمانہ میں دستیاب نہیں ہوتا۔ مفتی صاحب ایک جیّد عالم اور عربی زبان کے فاضل تھے مگر نہایت صاف

اور پُر لطف شعر کہتے تھے ۱۳۲۵ھ میں رحلت فرمائی۔ کلام کا انتخاب یہ ہے:۔

غزل (۸۱)

یہ کہہ کے رخنہ ڈلیے اُن کے حجاب میں
اچھے بُرے کا حال کھلے کیا نقاب میں

یارب وہ خواب حق میں مرے خوابِ گہ ہو
آئے وہ مستِ خواب اگر میرے خواب میں

حال اُس نگہ کا اُس کے سراپا میں کیا کہوں
مورِ ضعیف پھنس گئی جا شہدِ ناب میں

یارب یہ کس کے منہ سے اُلٹا نقاب ہے
شورِ خنے اب نکلنے لگے آفتاب میں

خورشید نیار ہوکے زمیں سے جھٹک فرا
سو آفتاب ہیں ترے گرد نقاب میں

کیا عقل محتسب کی کہ لایا ہے کھینچ کر
سودا زدوں کو محکمۂ احتساب میں

اُٹھنے میں صبح کے یہ کہاں سرگرانیاں
زاہد نے مے کا جلوہ یہ دیکھا ہے خواب میں

تحقیق ہو تو جانوں کہ میں کیا ہوں قیس کیا
لکھا ہوا ہے یوں تو سبھی کچھ کتاب میں

ہر ہر رویں سے خرقے کے میرے ہے خوں چکاں
غوطے تو سو دیے گئے زمزم کے آب میں

میں اور ذوقِ بادہ کشی؟ لے گئیں مجھے
یہ کم نگاہیاں تری بزمِ شراب میں

امدادِ چشم کیا ہو سکے دل کو آگ جب
جلنے کے بعد خوں نہیں رہتا کباب میں

ہیں دونوں مثلِ شیشۂ پیماں صد شکست
جیسا ہے میرے دل میں نہیں ہے حباب میں

یہ عمر اور عشق ہے افسردہ جائے شرم
حضرت یہ باتیں اچھی تھیں عہدِ شباب میں

(۳۲) غالب ۱۸۶۹ء

اسد اللہ خاں عرف میرزا نوشہ۔ المخاطب بہ نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ ۸ رجب ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۶ء میں بہ مقام آگرہ پیدا ہوئے شادی ہونے کے بعد میرزا صاحب نے دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ اور ۷۳ برس کی عمر میں ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء مطابق ۱۲۸۵ھ میں انتقال کیا۔ درگاہ حضرت نظام الدین اولیا کے احاطہ میں دفن ہوئے۔ وہ فارسی کے نظم و نثر کے مسلم الثبوت اُستاد سمجھے جاتے ہیں۔ اُردو انشا پردازی کی طرز جدید کے بانی تھے۔ ماہرین سخن کا قول ہی کہ ہندوستان میں شاعری کا آغاز امیر خسرو سے ہوا اور اس کا خاتمہ میرزا غالب پر ہوگیا۔ پنج آہنگ و دستنبو۔ مہر نیم روز وغیرہ آپ کی مشہور تصانیف ہیں علاوہ فارسی کلیات کے دیوان اُردو بھی موجود ہی جو اکثر مطابع کا چھپا ہوا بکتا ہی۔ ۱۹۱۵ء میں ایک خاص اڈیشن نہایت اہتمام اور جلی قلم عمدہ کاغذ پر مع میرزا کے فوٹو کے نظامی پریس بدایوں سے شایع ہوا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۱۶ء میں اسی پریس نے ایک عمدہ منشیح[1] اڈیشن نکالا جس میں علاوہ میرزا کے فوٹو کے اُن کی تحریر کا عکس بھی دیا گیا ہی۔ اس اُردو دیوان کی شرح مولانا طبا طبائی اور حسرت نے بھی لکھی ہی

[1] یہ شرح مولانا نظامی بدایونی نے لکھی ہی جو حال میں تیسری مرتبہ معہ دیوان ایک خوبصورت پاکٹ اڈیشن کی صورت میں شایع ہوئی ہی ۱۲

میرزا کا کلام آج کل کے تعلیم یافتہ گروہ میں نہایت دلچسپی سے پڑھا جاتا ہی۔ وہ اخلاقی اور فلسفی مسائل سے بھرا ہوا ہی اور ان کے تخیل میں وہ جدّت پائی جاتی ہی۔ جو کبھی پرانی ہونے والی نہیں۔ غالب کی طبیعت کو بعض لوگ دشوار پسند کہتے ہیں لیکن جہاں کہیں انھوں نے سلاست کو برتا ہی روانی کے دریا بہا دیئے ہیں اُردو زبان پر میرزا کا یہ بڑا احسان ہی کہ نثر میں مراسلے کو مکالمہ بنا کر خطوط نویسی کی ایک جدید طرز نکالی اور نظم میں ایسے اسلوب بیان کا نمونہ چھوڑا کہ ان کے نقش قدم پر چل کر موجودہ زمانہ کی نئے تعلیم یافتہ شعرا کو قدرت کے نقش و نگار سیاسی حالات فلسفی مسائل وغیرہ کا نظم کے ذریعہ سے ظاہر کرنا آسان ہوگیا۔ غالب کے حالات اور سوانح میں مولانا حالی کی مبسوط تصنیف یادگار غالب موجود ہی

غزل (۸۳)

یہ نہ تھی ہماری قسمت جو وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا۔ اگر استوار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی۔ جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہی کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا۔ کوئی غمگسار ہوتا

رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو۔ یہ اگر شرار ہوتا

غم اگرچہ جاں گسل ہی پہ کہاں بچیں کہ دل ہی
غم عشق گر نہ ہوتا۔ غم روزگار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہی شب غم بُری بلا ہی — مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

ہوے مر کے ہم جو رُسوا ہوے کیوں نہ غرق دریا — نہ کبھی جنازہ اُٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہی وہ یکتا — جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

یہ مسائل تصوّف! یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

(۸۳)

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا — ڈبویا مجھکو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ہوا جب غم سے یوں بیحس تو غم کیا سر کے کٹنے کا — نہ ہوتا گر جُدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہی
وہ ہر اک بات پہ کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

(۸۴)

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں — ہو رہیگا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاو — جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ | مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہی؟
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

۸۵

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا | جس دل پہ ناز تھا مجھے - وہ دل نہیں رہا
جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے | ہوں شمعِ کشتہ - درخورِ محفل نہیں رہا
مرنے کی ای دل - اور ہی تدبیر کر کہ میں | شایانِ دستِ و بازوے قاتل نہیں رہا
بر روے شش جہت - درِ آئینہ باز ہی | یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا
گو میں رہا رہینِ ستم ہاے روزگار | لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
دل سے ہواے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں | حاصل سواے حسرتِ حاصل نہیں رہا

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا - مگر اسدؔ
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

۸۶

لرزتا ہی مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر | میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ - ہو خارِ بیاباں پر

نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلودہ یاد آیا
کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

بجز پروازِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہوگا
قیامت اک ہوائے تند ہے خاکِ شہیداں پر

نہ لڑ ناصح سے غالب کیا ہوا گر اس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

۸۷

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور

مٹ جائے گا سر، گر ترا پتھر نہ گھسے گا
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

آئے ہو کل۔ اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ ہمیشہ نہیں۔ اچھا۔ کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو۔ قیامت کو ملیں گے
کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا؟ جو نہ مرتا کوئی دن اور

تم ماہِ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن اور

۸۸

ہم سے کھل جاؤ بہ وقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

غرۂ اوجِ بنائے عالمِ امکاں نہ ہو
اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

دھول دھپا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

٨٩

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے

ہے زلیخا خوش ! کہ محوِ ماہ کنعاں ہو گئیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو، کہ ہے شامِ فراق

میں یہ سمجھوں گا، کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام

قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

نیند اُس کی ہے، دماغ اُس کا ہے، راتیں اُس کی ہیں

تیری زلفیں جس کے بازو پہ پریشاں ہو گئیں

میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا

بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار

جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

بس کہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے بہ پے

میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

واں گیا بھی میں، تو ان کی گالیوں کا کیا جواب

یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا

سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

ہم موحّد ہیں۔ ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملّتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا اِن بستیوں کو تم۔ کہ ویراں ہو گئیں

	۹۰	

دل ہی تو ہے۔ نہ سنگ و خشت۔ درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار۔ کوئی ہمیں ستائے کیوں

دَیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم۔ غیر ہمیں اُٹھائے کیوں

جب وہ جمالِ دل فروز۔ صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز۔ پردے میں مُنہ چھپائے کیوں

دشنۂ غمزہ جاں ستاں۔ ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رُخ سہی۔ سامنے تیرے آئے کیوں

قیدِ حیات و بندِ غم۔ اصل میں دونوں ایک ہیں

موت سے پہلے آدمی - غم سے نجات پائے کیوں

حُسن اور اُس پہ حسنِ ظن - رہ گئی بوالہوس کی شرم

اپنے پہ اعتماد ہے - غیر کو آزمائے کیوں

واں وہ غرورِ عزّ و ناز - یاں یہ حجابِ پاسِ وضع

راہ میں ہم ملیں کہاں ؟ بزم میں وہ بُلائے کیوں

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی

جس کو ہوں دین و دل عزیز - اُس کی گلی میں جائے کیوں

غالبِ خستہ کے بغیر - کون سے کام بند ہیں

روئیے زار زار کیا - کیجیے ہائے ہائے کیوں

۹۱

غنچۂ ناشگفتہ کو - دور سے مت دکھا - کہ یوں

بوسے کو پوچھتا ہوں میں - منہ سے - مجھے بتا - کہ یوں

پرسشِ طرزِ دلبری کیجیے کیا کہ بن کہے

اُس کے ہر اک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

رات کے وقت مے پیے - ساتھ رقیب کو لیے

آئے وہ یاں خدا کرے - پر نہ کرے خدا کہ یوں

"غیر سے رات کیا بنی" یہ جو کہا۔ تو دیکھیے
سامنے آن بیٹھنا۔ اور یہ دیکھنا۔ کہ یوں
بزم میں اُس کے روبرو۔ کیوں نہ خموش بیٹھیے
اُس کی تو خامشی میں بھی۔ ہے یہی مدعا کہ یوں
میں نے کہا کہ "بزم ناز چاہیے غیر سے تہی"
سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں
مجھ سے کہا جو یار نے۔ جاتے ہیں ہوش کس طرح
دیکھ کے میری بیخودی چلنے لگی ہوا کہ یوں
کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی
آئینہ دار بن گئی۔ حیرتِ نقشِ پا۔ کہ یوں
گر ترے دل میں ہو خیال۔ وصل میں شوق کا زوال
موجِ محیطِ آب میں۔ مارے ہے دست و پا کہ یوں
جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سنا۔ کہ یوں

(۹۳)

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں

کافر ہوں۔ گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں
کب سے ہوں۔ کیا بتاؤں۔ جہان خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں
تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے۔ آئے جو خواب میں
قاصد کے آتے آتے۔ خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں
مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام؟
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں
جو منکرِ وفا ہو۔ فریب اُس پہ کیا چلے
کیوں بدگماں ہوں۔ دوست سے دشمن کے باب میں
میں مضطرب ہوں وصل میں۔ خوفِ رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں؟
میں اور حظِ وصل۔ خدا ساز بات ہے
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں
ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں
وہ نالہ! دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
جس نالے سے شگاف پڑے آفتاب میں
وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے؟
جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں
غالبؔ۔ چھٹی شراب۔ پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

۹۳

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے۔ یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتا نہ پائیں۔ تو ناچار۔ کیا کریں؟
کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ۔ اہل بزم
ہو غم ہی جاں گداز تو غم خوار کیا کریں؟

نکوہش ہی سزا فریادیِ بیدادِ دلبر کی
مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبحِ محشر کی

رگِ لیلیٰ کو خاکِ دشتِ مجنوں ریشگی بخشے
اگر بووے بجائے دانہ دہقاں نوکِ نشتر کی

پرِ پروانہ شاید بادبانِ کشتیِ مے تھا
ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی

کروں بیدادِ ذوقِ پرفشانی عرض کیا قدرت
کہ طاقت اُڑ گئی اُڑنے سے پہلے میرے شہپر کی

کہاں تک روؤں اُس کے خیمے کے پیچھے قیامت ہی
مری قسمت میں یارب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

۹۴

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

۹۵

تپش سے میری وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہی
مرا سر رنجِ بالیں ہی مرا تن بارِ بستر ہی

سرشکِ سر بہ صحرا دادہ نور العینِ دامن ہی
دلِ بے دست و پا افتادہ برخوردارِ بستر ہی

خوشا اقبالِ رنجوری عیادت کو جو تم آئے
فروغِ شمعِ بالیں۔ طالعِ بیدارِ بستر ہے

یہ طوفاں گاہ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی
شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے

ابھی آتی ہے بو بالش سے اُس کی زلفِ مشکیں کی
ہماری دید کو۔ خوابِ زلیخا۔ عارِ بستر ہے

کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں غالب
کہ بیتابی سے ہر اک تارِ بستر خارِ بستر ہے

۹۶

کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے
جفائیں کرکے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

خدایا جذبۂ دل کی۔ مگر تاثیر اُلٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

وہ بدخو، اور میری داستانِ عشق طولانی
عبارت مختصر۔ قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے

اودھر وہ بدگمانی ہے۔ ادھر یہ ناتوانی ہے
نہ پوچھا جائے ہے اُس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن
وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے۔ نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

۹۷

بازیچۂ اطفال ہی دنیا مرے آگے
ہوتا ہی شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہی اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہی اعجازِ مسیحا مرے آگے

جز نام- نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم- نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے

ہوتا ہی نہاں گرد میں صحرا مرے نزدیک
گھستا ہی جبیں- خاک پہ دریا مرے آگے

مت پوچھ- کہ کیا حال ہی میرا ترے پیچھے
تو دیکھ- کہ کیا رنگ ہی تیرا مرے آگے

سچ کہتے ہو- خود بین و خود آرا ہوں- نہ کیوں ہوں
بیٹھا ہی بتِ آئنہ سیما مرے آگے

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیِ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

نفرت کا گماں گزرے ہی- میں رشک سے گزرا
کیوں کر کہوں- لو نام نہ اُن کا مرے آگے

ایماں مجھے روکے ہی- جو کھینچے ہی مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہی- کلیسا مرے آگے

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہی مرا کام
مجنوں کو بُرا کہتی ہی لیلی مرے آگے

خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے
آئی شبِ ہجراں کی تمنا مرے آگے

ہی موجزن اک قلزمِ خوں- کاش یہی ہو
آتا ہی ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

گو ہاتھ کو جنبش نہیں- آنکھوں میں تو دم ہی
رہنے دو- ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہی میرا
غالب کو بُرا کیوں کہو- اچھا مرے آگے

۹۸

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

نے مژدۂ وصال نہ نظّارۂ جمال
مدّت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

مے نے کیا ہے حسنِ خود آرا کو بے حجاب
اے شوق یاں اجازتِ تسلیمِ ہوش ہے

گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا
کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

دیدار بادہ حوصلہ ساقی نگاہ مست
بزمِ خیال مے کدۂ بے خروش ہے

قطعہ

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبح دم جو دیکھیے آ کر تو بزم میں
نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

شرع و آئین پر مدار سہی
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

چال جیسے کڑی کمان کا تیر
دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

بات پر واں زبان کٹتی ہی
وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

نہ سُنو گر بُرا کہے کوئی
نہ کہو گر بُرا کرے کوئی

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

کون ہی جو نہیں ہی حاجت مند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلا کرے کوئی

(۹۹) سہرا [ل]

خوش ہو اے بخت کہ ہی آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادے جواں بخت کے سر پر سہرا

کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہی
ہی ترے حسنِ دل افروز کا زیور سہرا

[ل] غالب نے یہ سہرا ابوظفر بہادر شاہ کے چھوٹے بیٹے جواں بخت کی شادی کے موقع پہ لکھا تھا۔ مقطع کو سن کر بادشاہ نے خیال کیا کہ مقطع میں اُن کے استاد "ذوق" پہ

سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہی پر اے طرفِ کلاہ — مجھ کو ڈر ہی کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا

ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہونگے موتی — ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

سات دریا کے فراہم کیے ہونگے موتی — تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

رخ پہ دولھا کے جو گرمی سے پسینا ٹپکا — ہی رگِ ابرِ گہر بار سراسر سہرا

یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے — رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز — چاہیے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا

جب کہ اپنے میں سماوے نہ خوشی کے مارے — گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا

رخِ روشن کی دمک گوہرِ غلطاں کی چمک — کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا

تار ریشم کا نہیں ہی یہ رگِ ابرِ بہار — لائے گا تابِ گرانباریِ گوہر سہرا

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بڑھکر سہرا

(سہرا جو ذوق نے جواب میں لکھا)

اے جواں بخت مبارک تجھے سر پر سہرا — آج ہی یمن و سعادت کا ترے سر سہرا

تعریض کی گئی ہی چنانچہ بادشاہ کے اشارہ سے استاد ذوق نے بھی اسی ردیف وقافیہ میں ایک سہرا لکھا جو درج کردیا گیا ہی۔

آج وہ دن ہی کہ لائے دُرِ انجم سے فلک
کشتیٔ زر میں مہِ نو کی لگا کر سہرا

تابشِ حسن سے مانندِ شعاعِ خورشید
رُخِ پُر نور پہ ہی تیرے منور سہرا

وہ کہے صَلِّ علیٰ یہ کہے سُبحان اللہ
دیکھے مکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا

تانے اور بہنی میں رہے اخلاص بہم
گوندھیے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر سہرا

دھوم ہی گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی
گائیں مرغانِ نواسنج نہ کیونکر سہرا

روئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار
تار بارش سے تھا ایک سراسر سہرا

ایک کو ایک پہ تزئین ہی دمِ آرائش
سر پہ دستار رہی دستار کے اوپر سہرا

اک گہر بھی نہیں صد کانِ گہر میں چھوڑا
تیر ہوا یا ہی لے کے جو گوہر سہرا

پھرتی خوشبو سے ہی اترائی ہوئی بادِ بہار
اللہ اللہ رے پھولوں کا معطر سہرا

سر پہ طرہ ہی مزین تو گلے میں بدّھی
کنگنا ہاتھ میں زیبا ہی تو سر پہ سہرا

رونمائی میں تجھے دے مہ و خورشیدِ فلک
کھول دے منہ کو جو تو منہ سے اٹھا کر سہرا

کثرتِ تارِ نظر سے ہی تماشائیوں کے
وہم نظارہ ترے روئے نکو پہ سہرا

دُرِ خوش آب مضامیں سے بنا کر لایا
واسطے تیرے ترا ذوقِ ثنا گر سہرا

جن کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سنا دو اُن کو
دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

(١٠٠) قطعہ [1]

منظور ہی گزارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے

سو پشت سے ہی پیشۂ آبا سپہگری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہی صلحِ کل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

کیا کم ہی یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں
مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

استادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

جامِ جہاں نما ہی شہنشاہ کا ضمیر
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

میں کون اور ریختہ ہاں اس سے مدعا
جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے

سہرا لکھا گیا ز رہِ امتثالِ امر
دیکھا کہ چارہ غیرِ اطاعت نہیں مجھے

مقطع میں آپڑی ہی سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں۔ جنوں نہیں۔ وحشت نہیں مجھے

قسمت بری سہی۔ پہ طبیعت بری نہیں
ہی شکر کی جگہ۔ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

[1] مرزا نے اپنے سہرے کے جواب میں اُستاد ذوق کا سہرا سن کر اس قطعے کو بادشاہ کے حضور میں پیش کیا تھا۔

شہاب الدین خاں خلف الرشید نواب ضیاء الدین خاں نیر و رخشاں رئیس لوہارو۔ دہلی کے نامور رؤسا میں تھے۔ مرزا غالب مرحوم کے عزیز تھے اور شاعری میں انھیں سے تلمذ تھا۔ آپ اعلیٰ درجہ کا علمی مذاق رکھتے تھے۔ فارسی۔ اردو۔ دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ مرزا غالب کو ان کے ساتھ بڑی ہمدردی تھی۔ عالم جوانی میں ۱۸۶۹ء میں وفات پائی۔ ان کے بیٹے نواب شجاع الدین خاں تاباں اور نواب سراج الدین احمد خاں سائل اس وقت موجود ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

(۱۰۱) غزل

ہم قوتِ جذبِ دل دکھائیں — اور پھر وہ ہمارے گھر نہ آئیں

کیا چیر کے سینہ دل دکھائیں — کچھ حال سنو تو ہم سنائیں

اے بخت کہاں تلک برائی — اے چرخ کہاں تلک جفائیں

ہم سینہ سپر کیے کھڑے ہیں — وہ شوق سے خنجر آزمائیں

جو کام ہیں غیر کے ہوئیں صرف — افسوس وہ دلربا ادائیں

شاید کہ ہے گرمِ نالہ ثاقب — چلتی ہیں شرر فشاں ہوائیں

۱۰۲

فکر وصال و ہجر کا صدمہ اُٹھائیے | اس چند روزہ زیست میں کیا کیا اٹھائیے
بے لطف زندگی سے تو مرنا ہی خوب ہے | کیا فائدہ کہ نازِ مسیحا اُٹھائیے
آؤ نہ آؤ ہم بھی ہیں خوگرِ شکیب کے | جی چاہتا ہے ذوقِ تمنا اُٹھائیے
رکتے ہیں لوگ خلوتِ دشمن کا اہتمام | بے پردگی ہے پردہ ہے پردہ اُٹھائیے
بیٹھے ہیں اب تو ہم دلِ بے آرزو لیے | وہ دن گئے کہ داغِ تمنا اُٹھائیے

(۱۳۴) شیفتہ ۱۸۶۹ء

نواب محمد مصطفےٰ خاں خلف نواب عظیم الدولہ سرفراز الملک مرتضیٰ خاں بہادر رئیس دہلی و تعلقدار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر۔ آپ نواب ولی داد خاں مرحوم خاندان بنگش کی اولاد میں تھے سنہ ۱۸۰۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ مشہور معلمین اور کاملین سے عربی۔ فارسی پڑھی۔ آپ کو علوم مروجہ میں اعلیٰ درجہ کی لیاقت حاصل تھی۔ غدر سے پہلے دہلی میں مستقل سکونت تھی اور وہاں کی سوسائٹی سے بہرہ اندوز تھے سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے جہانگیر آباد میں رہنے لگے اور شاعری کو خیرباد کہدی۔ آپ اردو کی طرح فارسی میں بھی زبردست شاعر اور صاحب دیوان تھے اور حسرتی تخلص کرتے تھے۔ حکیم مومن خاں صاحب مومن دہلوی کے شاگرد تھے اور ان کی وفات کے بعد حضرت غالب سے مشورہ سخن رکھتے تھے

دیوان ریختہ میں۔ حکمت۔ تصوف۔ اخلاق حسن و عشق کے جذبات اور ہر قسم کے مضامین موجود تھے اور ہر موقع پر سنجیدگی اور متانت کا خیال رکھا ہی سنہ ۱۲۵۰ھ میں آپ نے تذکرہ گلشن بیخار مرتب کیا تھا۔ جس میں اردو شعرا کے حالات اور کلام درج ہی۔ اردو زبان کا یہ پہلا تذکرہ ہی جس میں شعرا کے کلام پر آزادانہ رائے بھی دی گئی ہی۔ آپ نے سنہ ۱۲۸۶ھ میں انتقال فرمایا آپ کی کلیات جس میں فارسی اردو کا کلام اور واقعات شیفتہ بہ زبانِ فارسی شامل ہیں مع مصنف کی سوانح عمری اور فارسی و اردو کے کلام پر ایک مبسوط تنقید کے مولانا نظامی بدایونی نے مرتب کیا ہی۔ جو نواب صاحب کے صاحبزادہ نواب محمد اسحاق خاں صاحب مرحوم کے ایماسے نظامی پریس بدایوں میں نہایت اہتمام کے ساتھ چھپکر سنہ ۱۹۱۵ء میں شائع ہوا تھا۔

کلام کا نمونہ یہ ہی۔

۱۰۳ غزل

ساقی کو میکدہ میں سرِ ناؤ نوش ہی
صوفی کو خانقہ میں سرِ وجد حال ہی

عاشق کو اضطراب ہی عجز و نیاز سے
معشوق کو غرور ہی غنج و دلال ہی

منظور ہی حکیم کو ہر شے کی معرفت
حالانکہ اپنی معرفت اس کو محال ہی

ہر کام فلسفی کا سفاہت کے ساتھ ہی
ہر بات منطقی کی مرادِ جدال ہی

اربابِ حکمتِ نظری کو عمل نہیں
اہلِ کلام کو ہوسِ قیل و قال ہی

جن کو کہ دستگاہ ہی فن نجوم میں
عمر اُن کی صرف زائچۂ ماہ و سال ہی

ہیں بعض لوگ درپے اسراف رات دن
بعضوں کو روز و شب سرِ توفیرِ مال ہے

بعضوں کو ہے مذاق میں فخرِ نسب لذیذ
بعضوں کو ذوقِ دعویِ فضل و کمال ہے

مفلس کو فکر ہے کہ کسی ڈھب سے کچھ ملے
منعم غریقِ لجۂ بیم و زوال ہے

جو ہیں مریضِ سیرِ چمن ان کو بزم میں
ذکرِ شجر کبھی کبھی فکرِ نہال ہے

جی میں کسی کے خواہشِ آرائشِ لباس
دل میں کسی کے حسرتِ جاہ و جلال ہے

کوئی طلب میں اشہبِ گلگوں نظیر کی
کوئی اسیرِ شوقِ شکارِ غزال ہے

کوئی فدائے قامتِ آفت خرام ہے
کوئی خرابِ نرگسِ جادو مثال ہے

ناحق کسی کو شکر کسی کو شکایتیں
بے وجہ کوئی خوش ہے کسی کو ملال ہے

کس واسطے ہم آئے ہیں دنیا میں شیفتہ
اس کا جو دیکھیے تو بہت کم خیال ہے

١٠٤ غزل

کل نغمہ گر جو مطرب جادو ترانہ تھا
ہوش و حواس و عقل و خرد کا پتا نہ تھا

یہ بیت کہ جائے شیب ہے جب تھا نقاب میں
عہدِ شباب اور بتوں کا زمانہ تھا

معلوم ہے ستاتے ہو پھر اک بہانے سے
قصداً نہ آئے رات حنا کا بہانہ تھا

حسرت سے اس کے کوچہ کو کیونکر نہ دیکھیے
اپنا بھی اس چمن میں کبھی آشیانہ تھا

کیا میکدوں میں ہے کہ مدارس میں وہ نہیں
البتہ ایک واں دلِ بے مدعا نہ تھا

ساقی کی بے مدد نہ بنی بات رات کو	مطرب اگرچہ کام میں اپنے یگانہ تھا
کچھ آج اُن کی بزم میں بیٹھا سبب ہی نہیں	آلودہ مے سے دامن باد صبا نہ تھا
دشمن کے فعل کی نہیں توجیہ کیا ضرور	تم سے فقط مجھے گلۂ دوستانہ تھا

کل شیفتہ سحر کو عجب حالِ خوش میں تھے
آنکھوں میں نشہ اور لبوں پہ ترانہ تھا

۱۰۵ قطعہ

کہا کل میں نے اے سرمایۂ ناز	تلوّن سے ہے تم کو مدعا کیا
کبھی مجھ پر عتابِ بے سبب کیوں	کبھی بے وجہ غیروں سے وفا کیا
کبھی محفل میں وہ بیباکیاں کیوں	کبھی خلوت میں یہ شرم و حیا کیا
کبھی تمکینِ صولت آفریں کیوں	کبھی الطافِ جرأت آزما کیا
کبھی وہ طعنہ ہائے جانگزا کیوں	کبھی یہ غمزہ ہائے جاں فزا کیا
کبھی شعروں سے میری نغمہ سازی	کبھی کہنا کہ یہ تم نے کہا کیا
کبھی بے جرم یہ آزردہ ہونا	کہ کیا طاقت جو پوچھوں میں خطا کیا
کبھی اس دشمنی پر بہت سکیں	پے ہم جلوہ ہائے دلربا کیا
یہ سب طول اُس نے سُن کر بے تکلف	جواب اک مختصر مجھ کو دیا کیا
ابھی اے شیفتہ واقف نہیں تم	کہ باتیں عشق میں ہوتی ہیں کیا کیا

(۳۵) شوق ۱۸۷۱ء

حکیم تصدق حسین خاں عرف نواب میرزا آغا علی خاں لکھنوی۔ صاحب تذکرۂ سخن شعرا نے اُن کو آتش کا شاگرد لکھا ہے اس کے سوا اور کوئی تحقیق نہیں۔ زہرِ عشق۔ بہارِ عشق۔ فریبِ عشق۔ لذتِ عشق کے مصنف تھے۔ ان مثنویوں کو تصنیف ہوئے قریب ۷۰ سال کے گزرنے۔ مثنوی زہرِ عشق کا سال تصنیف ۱۲۷۷ھ (غم دلربا) سے برآمد ہوتا ہے طرزِ بیان سلیس ہے۔ لکھنؤ کے محاورات۔ روزمرہ بول چال۔ ضرب الامثال کے ساتھ ہی ساتھ جذبات کی تصویر خوب کھینچی ہے۔ اِن سب مثنویوں میں زہرِ عشق اپنے واقعہ کے لحاظ سے زیادہ دل گداز ہے۔ ایک موقعہ پر اس میں دنیا کی بے ثباتی کا جو نقشہ دکھایا ہے۔ خوب ہے۔ تقریباً ۱۲۸۸ھ مطابق ۱۸۷۱ء میں انتقال ہوا۔ زہرِ عشق کا انتخاب یہ ہے:

اقربا ہو گئے مرے آگاہ — تم سے ملنے کی اب نہیں کوئی راہ
مشورے ہو رہے ہیں آپس میں — بھیجتے ہیں مجھے بنارس میں
گو ٹھکانے نہیں تھے ہوش و حواس — پر یہ کہنے کو آئی ہوں ترے پاس
جائے عبرت سرائے فانی ہے — موردِ مرگ نوجوانی ہے
اونچے اونچے مکان تھے جن کے — آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے

کل جہاں پر شگوفہ و گل تھے
آج دیکھا تو خار بالکل تھے

جس چمن میں تھا بلبلوں کا ہجوم
آج اس جا ہے آشیانۂ بوم

بات کل کی ہے نوجواں تھے جو
صاحبِ نوبت و نشاں تھے جو

آج خود ہیں نہ ہیں مکاں باقی
نام کو بھی نہیں نشاں باقی

غیرتِ حور مہ جبیں نہ رہے
ہیں مکاں گر تو وہ مکیں نہ رہے

جو کہ تھے بادشاہِ ہفت اقلیم
ہوئے جا جا کے زیرِ خاک مقیم

کوئی لیتا بھی اب نہیں یہ نام
گور سنی گور میں گیا بہرام

اب نہ رستم نہ سام باقی ہے
اک فقط نام ہی نام باقی ہے

کل جو رکھتے تھے اپنے فرق پہ تاج
آج ہیں فاتحہ کو وہ محتاج

تھے جو خود سر جہان میں مشہور
خاک میں مل گیا سب ان کا غرور

عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے
نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے

گردشِ چرخ سے ہلاک ہوئے
استخواں تک بھی ان کے خاک ہوئے

تھے جو مشہور قیصر و فغفور
باقی ان کا نہیں نشانِ قبور

تاج میں جن کے ٹکتے تھے گوہر
ٹھوکریں کھاتے ہیں وہ کاسۂ سر

رشکِ یوسف جو تھے جہاں میں حسیں
کھا گئے ان کو آسمان و زمیں

ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے
یہی دنیا کا کارخانہ ہے

ہے نہ شیریں نہ کوہ کن کا پتا
نہ کسی جا ہے ملدمن کا پتا

ہوئے یوسف تمام چھیلی ہی — باقی اب قیس ہی نہ لیلی ہی

صبح کو طائرانِ خوش الحان — پڑھتے ہیں کل من علیہا فان

موت سے کس کو رستگاری ہی — آج وہ کل ہماری باری ہی

زندگی بے ثبات ہی اس میں — موت عینِ حیات ہی اس میں

ہم بھی گر جان دیدیں کھا کر سم — تم نہ رونا ہمارے سر کی قسم

دل کو ہم جولیوں میں بہلانا — یا مری قبر پر چلے آنا

جا کے رہنا نہ اس مکان سے دور — ہم جو مر جائیں تیری جان سے دور

روح بھٹکے گی گر نہ پائے گی — ڈھونڈتے کس طرف کو جائیگی

روکے رہنا بہت طبیعت کو — یاد رکھنا مری وصیت کو

ضبط کرنا اگر ملال رہے — میری رسوائی کا خیال رہے

میرے مرنے کی جب خبر پانا — یوں نہ دوڑے ہوئے چلے آنا

جمع ہو لیں سب اقربا جس دم — رکھنا اُس وقت تم وہاں نہ قدم

کہے دیتی ہوں جی نہ کھونا تم — سامنے تابوت کے نہ رونا تم

ہو گئے تم اگرچہ سودائی — دور پہونچے گی میری رسوائی

لاکھ تم کچھ کہو نہ مانیں گے — لوگ عاشق ہمارا جانیں گے

طعنہ زن ہوں گے سب غریب و امیر — قبر پہ بیٹھنا نہ ہو کے فقیر

سامنا ہو ہزار آفت کا — پاس رکھنا ہماری عزت کا

جب جنازہ مرا عزیز اٹھائیں
میری میت پہ دھیان رکھیے گا
تذکرہ کچھ نہ کیجیے گا مرا
اشک آنکھوں سے مت بہائیگا
آپ کاندھا نہ دیجیے گا مجھے
رنگ دل کے بدل نہ جائیں کہیں
ساتھ چلنا نہ سر کے بال کھلے
ہوتے آتش کے ہیں یہ پرکالے
ذکر سن کر مرا نہ رو دینا
رنج فرقت مرا اٹھا لینا
رنج کرنا نہ میرا ہیں قربان
دل ہیں کڑھنا نہ مجھ سے چھوٹے تو
آکے رو لینا میری قبر کے پاس
آنسو چپکے سے دو بہا لینا
اگر آجائے کچھ طبیعت پر
غنچۂ دل مرا کھلا جانا
ہے یہ حاصل سب انہی باتوں سے

آپ بیٹھے وہاں نہ اشک بہائیں
بند اپنی زبان رکھیے گا
نام منہ سے نہ لیجیے گا مرا
ساتھ غیروں کی طرح جائیے گا
سب ہیں رسوا نہ کیجیے گا مجھے
منہ سے نالے نکل نہ جائیں کہیں
تا کسی شخص پر نہ حال کھلے
تاڑ جاتے ہیں تاڑنے والے
میری عزت نہ یوں ڈبو دینا
جی کسی اور جا لگا لینا
سن لو گر اپنی جان ہی تو جان
جان دینا نہ گھونٹ گھونٹ کے تو
تا نکل جائے تیرے دل کی بھڑاس
قبر میری گلے لگا لینا
پڑھنا قرآن میری تربت پر
پھول تربت پہ دو چڑھا جانا
مٹی دینا تم اپنے ہاتوں سے

عمر بھر کون کس کو روتا ہے	کون صاحب کسی کا ہوتا ہے
کبھی آجائے گر ہمارا دھیان	جانتا ہم پہ ہو گئی قربان
دل میں کچھ آنے دیجئے نہ ملال	خواب دیکھا تھا سمجھئے یہ خیال
مرگ کا کس کو انتظار نہیں	زندگی کا کچھ اعتبار نہیں

(۳۳۶) اسیر ۱۸۷۳ء

تدبیر الدولہ مدبّر الملک سید مظفر علی خاں ولد سید مدد علی قصبۂ امیٹھی ضلع لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ عربی میں جملہ علوم و فنون کے کتابیں علماء فرنگی محل سے پڑھی تھیں۔ شاعری میں شیخ غلام ہمدانی مصحفی امروہوی سے تلمذ تھا۔ نصیر الدین حیدر شاہ کے عہد حکومت میں شاہی متوسل تھے۔ امجد علی شاہ کا زمانہ بھی دیکھا۔ پھر واجد علی شاہ کی مصاحبت میں کئی برس گزارے اور کلکتہ میں ان کے ساتھ رہے۔ بعد ازاں ریاست رامپور میں چلے آئے۔ بڑے پرگو کہنہ مشق قادر الکلام شاعر تھے۔ آپ کی غزلیات میں اخلاقی مضامین زیادہ ہیں۔ چھ دیوان چھوڑے۔ آپ کا ایک فارسی کا دیوان بھی موجود ہے۔ علم عروض۔ معانی بیان سے کامل واقفیت تھی۔ ۱۲۹۹ھ میں بمقام رامپور انتقال کیا۔ کلام یہ ہے۔

غزل

آہ کب لب پہ نہیں ہے داغ کب دل میں نہیں
کونسی شب ہے کہ گرمی اپنی محفل میں نہیں

بزم کی کثرت سے اندیشہ مرے دل میں نہیں
دل میں اس کی ہے جگہ میرے جو محفل میں نہیں

پنجۂ مژگانِ تر نے یہ اڑائیں دھجیاں
تار باقی ایک بھی دامانِ ساحل میں نہیں

خونِ ناحق کا ہمارے داغ مٹنے کا نہیں
تیغ میں ہوگا اگر دامانِ قاتل میں نہیں

پردہ دار چہرۂ یوسف ہیں یہ ہر نقاب
حسن لیلی جلوہ گر ہر ایک محمل میں نہیں

نجد کا صحرا عجب صحرائے وحشت خیز ہے
قیس کیا لیلی کو بھی آرام منزل میں نہیں

جس طرف جی چاہیگا میرا نکل جاؤنگا میں
سیکڑوں دروازے ہیں حلقے سلاسل میں نہیں

بندھ گئی زلفِ سیاہ یار کی ایسی ہوا
لاکھ شمعیں جل رہی ہیں نور محفل میں نہیں

حد سے باہر پاؤں جو رکھتا ہے ہوتا ہے خراب
گھر میں جو راحت مسافر کو ہے منزل میں نہیں

ڈوبنے جاتے ہیں کیونکر لوگ حیرت ہے مجھے
قدِ آدم آب بحرِ تیغِ قاتل میں نہیں

ہم غریبوں کا خدا ہے ناخدا درکار کیا
طالبِ ملاح کشتی دستِ سائل میں نہیں

ہو گیا دہشت سے ایسا بسملوں کا خون خشک
ایک بھی دھبا لہو کا تیغِ قاتل میں نہیں

میرے زخموں کے لیے تیار ہو مرہم اسیر
اس قدر زنگار بھی شمشیرِ قاتل میں نہیں

(۳۷) نظام سنہ ۱۸۷۲ع

سید نظام علی شاہ خلف سید احمد شاہ۔ آپ ریاست رامپور کے سادات سے تھے آزاد منش۔ آشفتہ مزاج رندانہ طبیعت رکھتے تھے۔ عاشقانہ معاملات کو خوب لکھتے تھے۔ ابتدائی کلام شیخ علی بخش بیمار کو دکھایا۔ پھر نواب صاحب یوسف علی خاں بہادر ناظم سے اصلاح لی۔ ۲۵ر شعبان سنہ ۱۲۸۹ھ مطابق سنہ ۱۸۷۲ع وفات پائی۔ دیوان مرنے کے بعد ریاست رامپور میں شائع ہو چکا ہے۔

نمونہ کلام یہ ہے:-

۱۰۸۔ غزل

جو سرگزشت اپنی ہم کہیں گے۔ کوئی سنیگا تو کیا کریں گے

جو یاد آئیں گی تیری باتیں تو پہروں چپ ہی رہا کریں گے

الٰہی قاصد ابھی نہ آئے کہ یہ توقع بھی ہے غنیمت

کیا گر انکار صاف اُس نے تو دل کو تسکین کیا کریں گے

عبث ہے ہر دم کا چونکنا ہے۔ عبث یہ اُٹھ اُٹھ کے دیکھنا ہے

بھلا وہ ایسے ہوئے تھے کس دن۔ وہی تو وعدہ وفا کریں گے

یہ سچ ہے ناصح نہ ہوگا ملنا نہیں ہے اچھا نہ ہوگا اچھا
پھر آپ کو کیا، برا کریں گے تو اپنے حق میں برا کریں گے

نظام۔ تقریر بھی عبث ہے جواب کچھ اس کا دے سکو گے
وہ اُس کا ہر بات پہ یہ کہنا کہ ہم تو اپنا کہا کریں گے

(۳۸) مہر ۱۸۷۳ء

میرزا حاتم علی۔ خلف میرزا فیض علی قزلباش۔ آپ اکبرآباد کے مشہور روساء سے تھے۔ فن سخن میں شیخ امام بخش ناسخ کے تلمیذ رشید تھے رعایت لفظی کے دلدادہ۔ تشبیہات اور استعارات کے مرد میدان میرزا غالب کے دوست تھے۔ غدر سے پہلے چنار میں منصف رہے سنہ ۱۸۷۲ء میں زندہ تھے۔ ان کا دیوان چھپ چکا ہے۔ کلام کا انتخاب یہ ہے:۔

۱۰۹ غزل

گریباں ہاتھ میں ہے پاؤں میں صحرا کا داماں ہے
کہاں یہ ابروئے خمدار کب یہ چشم فتاں ہے
جلاتا ہے یہ پروانوں کو وصفِ شعلہ رویاں سے

بس اب پاؤں میں اپنے اور سر خار مغیلاں ہے
بیاضِ چشم آہویاں کتابِ طاقِ نسیاں ہے
زبانِ خامہ بھی اب تو زبانِ شمعِ سوزاں ہے

ہوا لے دشت وحشت ہم کو لے اڑتی ہے بستی سے
ہمارا عنصر خاکی مگر ریگ بیاباں ہے

جیسے اہل ریاضی برج آبی کہتے ہیں شاید
وہ ساونچا تیرے آنسو ڈھالنے کا چشم گریاں ہے

سبق کو دیکھتا ہوں رات بھر اور پھر الجھتا ہوں
مطول مختصر وہ شرح شعر زلف پیچاں ہے

نہ کیوں ہر طرز میں پڑھنا غزل اس طرح کے آگے
مرا استاد کامل مہر ناسخ سا سخنداں ہے

(۳۹) سالک ۱۸۷۳ء

میرزا قربان علی بیگ۔ خلف میرزا عالم بیگ دہلوی۔ آپ کے اسلاف حیدر آبادی تھے۔ میرزا صاحب دہلی میں پیدا ہوئے۔ عربی فارسی میں ذی استعداد تھے۔ شاعری میں پہلے حکیم مومن خاں صاحب دہلوی کے شاگرد ہوئے۔ پھر تلامذۂ غالب میں داخل ہو گئے۔ مضمون آفریں۔ بلند خیال۔ عالی دماغ شاعر تھے۔ ایک دیوان ہنجار سالک کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ آپ ریاست الور میں وکیل تھے۔ وفات کو قریب ۳۰ سال کے ہوئے۔ سنہ ۱۳۰۳ھ تک زندہ تھے۔ کلام یہ ہے۔

۱۱۰

غزل

یک حقیقت میں بھی ہم کر کے بیان ہیں
اس سے ظاہر ہے نہیں خلد نشان ہیں

اس کے مٹنے سے ہوئی عالم بالا کی نمود — ورنہ تھی رشک فلک شوکت و شان دہلی

کس کا پتھر کا ہے دل کس سے سنا جاتا ہے — کون ایسا ہے کہ ہو جس سے بیان دہلی

ہے خط و خال کا عالم وہی اب تک گویا — ہے اسی وقت کی نکلی ہوئی جان دہلی

حسرتوں کا ہے مکینوں کی عجب ہنگامہ — رہے آباد اجڑ کر بھی مکان دہلی

مٹ گئے پر بھی تو ملتا نہیں دہلی کا جواب — کوئی ڈھونڈے تو اسی پر ہو گمان دہلی

ہوتے ہیں دور کے بس ڈھول سہانے واعظ — خلد میں کیا ہے نہیں ہے جو میان دہلی

میں نے دیکھا ہے ملائک کو خریدار اس کا — میں نے چلتی ہوئی دیکھی ہے دکان دہلی

غالب و نیر و ثاقب سے بنا ہے گویا — بلی ماروں کا محلہ صفہان دہلی

سن کے یہ شعر یہ آنکھیں ہوں کیونکر نمناک
سالک اک عمر سے ہے مرثیہ خوان دہلی

۱۱۱

مری خاطر میں کب ساقی ترا پیمانہ آتا ہے — کہ یاں ہر دم خیال نرگس مستانہ آتا ہے

ٹھکانے جستجو کے یار میں کس کس کے چھوٹے ہیں — کہ بلبل بزم میں اور باغ میں پروانہ آتا ہے

نکل کر آنکھ سے غائب نہیں ہوتے ہیں یہ آنسو — اسی پانی سے بھرتا عمر کا پیمانہ آتا ہے

الٰہی لوگ کیوں ہوتے ہیں خوش فردوس جانے سے — مگر اس باغ سے آگے کوئی ویرانہ آتا ہے

دل زار او دشت یار میں اک راہ مخفی ہے — خطا ہو کر بھی سیدھا ناوک جانانہ آتا ہے

ترے کوچے میں جو جاتا ہے کیا انساں پر جادو — ابھی ہشیار جاتا ہے ابھی دیوانہ آتا ہے
گیا جو اس خم گیسو میں ال کا ہو ہا سالک — یہ حیرت ہے سلامت کیونکہ پھر کرشانہ آتا ہے

۴۰ دبیر سنہ ۱۸۷۴ء

دبیر۔ میرزا سلامت علی۔ خلف میرزا غلام حسین ان کے آباؤ اجداد کا وطن دہلی تھا۔ مگر میر انیس ہی کی طرح ان کا بھی آفتاب سخن لکھنؤ میں طلوع ہوا۔ شاعری میں میر مظفر حسین صاحب ضمیر کے شاگرد تھے۔ مرثیہ گوئی میں میر انیس کے مد مقابل تھے۔ اور اصل یہ ہے کہ دونوں آفتاب و ماہتاب تھے جس طرح میر انیس کی فصاحت مسلمہ ہے اسی طرح آپ کی بلاغت۔ ان کے مرثیے کئی جلدوں میں طبع ہو چکے ہیں۔ ۲۹ محرم سنہ ۱۲۹۲ھ مطابق سنہ ۱۸۷۴ء کو انتقال فرمایا۔ کلام یہ ہے:

۱۱۲۔ تلوار

جب مورچے پہ بجلی تیغ دو سر گئی — چنگے بھلوں کو سارے سے دیوانہ کر گئی
ہر صف میں خاک اڑا کے ادھر سے ادھر گئی — پھر یہ نہا نہا کے لہو میں نکھر گئی

عالم نہ پوچھ قطرہ فشانی کے حسن کا
جوبن ٹپک رہا تھا جوانی کے حسن کا

آگے کبھی بڑھی۔ کبھی پیچھے کو پھر پڑی — سر پر جو لڑکھڑائی تو شانوں پہ گر پڑی
بچو بچو لعینوں سے کی وہ مصر پڑی — افتاد ان سے پوچھیے یہ جن کے سر پڑی

اُٹھی گری، بلند ہوئی، پست ہو گئی
پی پی کے مے کشوں کا لہو مست ہو گئی

رجز

ہم دل میں جب در آئیں گے فوج شریر کے
جوہر کھلیں گے طاقت بازوئے پیر کے
ٹکڑے کریں گے خنجر و شمشیر و تیر کے
وارث ہیں ذوالفقار جناب امیر کے
اک اک کی موت آج حسامِ دوسر سے ہے
قبضہ قضا کی تیغ پہ حکمِ قدر سے ہے

۱۱۳- حضرت اصغر کی فرقت میں ماں کی بیتابی

بانو پچھلے پہر اصغر کے لیے روتی ہے
ایک وہ جاگتی ہے خلقِ خدا سوتی ہے
سر کو بھی پیٹتی ہے جان کو بھی کھوتی ہے
پر عجب غم ہے کہ تسکین نہیں ہوتی ہے
پیٹتے پیٹتے بے ہوش جو ہو جاتی ہے
دل سے ہر بار علی اصغر کی صدا آتی ہے

سوگ کا فرش ہے اور سامنے جلتا ہے چراغ
بازو میں داغِ رسن سینے میں اولاد کا داغ
جان اندوہ میں دل رنج میں آشفتہ دماغ
نہ وہ گل ہیں نہ وہ غنچے ہیں نہ زہرا کا وہ باغ
گوشۂ چادر کا اگر سر سے سرک جاتا ہے
ننگے سر کوفے میں پھرنا اُسے یاد آتا ہے

ہائے اصغر! نہ ترا دفن ہوا مجھ سے ادا
بوجھ کوئی مری گردن سے نہ اُترا تیرا
نہ تری سالگرہ کی، نہ ترا بیاہ کیا
نہ لحد تجھ کو ملی اور نہ کفن تجھ کو ملا
ذبح تم ہو گئے سینے پہ لٹاؤں کس کو
چھوٹے چھوٹے یہ شلوکے ہیں پنہاؤں کس کو

۴۱- نواب ۱۸۸۷ء

نواب کلبِ علی خاں خلد آشیاں والیٔ رام پور۔ نواب یوسف علی خاں کے صاحبزادے تھے۔ شاعری میں منشی امیر احمد صاحب امیرؔ مینائی لکھنوی کے شاگرد تھے۔ معقول و منقول کی کتابیں مولانا فضلِ حق صاحب خیرآبادی سے پڑھی تھیں۔ آپ کے عہد میں رامپور مشرقی علوم و فنون کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ہر فن کے کامل موجود رہتے تھے۔ اردو فارسی دیوان موجود ہیں۔ نہایت علم دوست اور شریف نواز تھے۔ تاریخ ولادت ۲۰ ذی حجہ ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۹ اپریل ۱۸۳۵ء وفات ۲۷ جمادی الآخر ۱۳۰۴ھ مطابق ۲۳ مارچ ۱۸۸۷ء

نمونۂ کلام یہ ہے:-

۱۱۴ غزل

ہلے کیونکر نہ تیری رہ گزر کی سرزمیں سوں
کہ نالوں سے مرے کانپا کیا عرشِ بریں سوں

بھلا کیا خاک سوئے چین سے وہ کنجِ مرقد میں
رہا ہو جس کے سر کا تکیہ دوشِ نازنیں سوں

تری صورت کا نقشہ جب کبھی کھنچ جائیگا پورا
تو صنعت پہ کریگا ناز صورت آفریں سوں

عجب حسرت سے دیکھا ہے سوئے جاناں دمِ آخر
رہیگی یاد اُس کو بھی نگاہِ واپسیں سوں

اُڑا ایں دھجیاں ہاتوں نے اس کی جوشِ وحشت سے
رہی تھی دیدۂ خونبار پر جو آستیں سوں

کیا عشق کمر نے بے نشاں ایسا نہ پائیں گے
عدم میں بھی اگر ڈھونڈیں گے مجھ کو ہمنشیں سوں

رفاقت لذت زخم جگر تیری ہی جب جانوں
کہ مرقد میں بھی میرے منہ سے نکلے آفریں سوں

ہوئے ہونگے کسی سے وصل کے اقرار بھی شاید
رہی ہم سے تو اس بے رحم کافر کی نہیں سوں

نصیبوں میں جو لکھی ہے برائی وہ نہ جائے گی
اگر رگڑوں گا در پر کعبہ کے نقش جبیں برسوں

اسیر دام گیسو دل ہوا تو یوں بھی وحشت ہے
نہ چھوڑوں گا کبھی ہاتوں سے زلف عنبریں سوں

اسی امید پر شاید کسی دن آؤ تم باہر
نہ جائینگے تمہارے در سے دم بھر کو کہیں سوں

بغل سے اس کی ٹھہر گیا نہ لے نواب کوئی بھی
رہیں گے دیکھ لینا کوچۂ جاناں میں ہمیں برسوں

(۴۷) حیا ۱۸۷۷ء

شاہزادہ میرزا رحیم الدین خلف میرزا کریم الدین پسا نبیرہ شاہ عالم ثانی نے سنہ ۱۲۲۲ھ میں پیدا ہوئے شاعری میں حضرت شاہ نصیر دہلوی سے تلمذ تھا۔ ذہین طباع اور نازک خیال شاعر تھے۔ شطرنج کھیلنے میں مشہور تھے۔ ولایت سے جتنے شطرنج کے نقشے آتے تھے۔ اُن کو حل کرنا آپ کا کام تھا۔ داغ و امیر کے ہمعصر تھے۔ نواب کلب علی خاں خلد آشیاں والی رامپور کے مصاحبوں میں داخل تھے۔ سنہ ۱۲۹۴ھ میں دنیا سے رخصت ہو گئے ۷۲ سال کی عمر پائی۔ ان کا دیوان صاحب محمود علی خاں رامپوری نے چھپوایا تھا۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

غزل ۱۱۵

موت ہی چارہ ساز فرقت ہے
رنج مرنے کا مجھ کو راحت ہے

ہدف تیر لوح تربت ہے
بعد مردن بھی یہ اذیت ہے

ہو چکا وصل وقت رخصت ہے
اے اجل جلد آ کہ فرصت ہے

روز کی داد کون دیوے گا
ظلم کرنا تمہاری عادت ہے

کارواں عمر کا ہے رخت بدوش
ہر نفس بانگ کوس رحلت ہے

سانس اک پھانس سی کھٹکتی ہے
دم نکلتا نہیں . مصیبت ہے

تم بھی اپنے حبا کو دیکھ آؤ
آج اس کی کچھ اور حالت ہے

(۴۳) قلق سنہ ۱۸۸۰ء

خواجہ ارشد علی خاں بن خواجہ بہادر حسین فراق لکھنوی۔ آپ خواجہ وزیر لکھنوی کے خواہرزادہ تھے۔ اور شعر گوئی میں انھیں سے تلمذ حاصل تھا اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کے مصاحبین میں سے تھے۔ جب ولیعہد کی شادی ہوئی تو انھیں خلعت دیا گیا مگر دربار شاہی سے

خطاب نہ عطا ہوا۔ خلعت کو زیب تن کرتے ہوئے فوراً یہ شعر پڑھا ؎

خلعت وزیر سے تو سب کچھ میں سنوارا جاؤں
ایسی شادی میں تلق کہہ کے پکارا جاؤں

بادشاہ نے اسی وقت اُن کو آفتاب الدولہ کا خطاب عطا فرمایا۔ اور دیگر مقربین سے زیادہ مرتبہ بلند کیا۔ ۱۸۵۷ء میں زندہ تھے۔ اس کے چند سال کے بعد انتقال ہوا۔ دیوان موجود ہے ایک مثنوی "طلسم الفت" چھوڑی۔ اس میں عشق و محبت کی جیتی جاگتی تصویریں دکھائی گئی ہیں جس کا ڈراما ہندوستان کی مشہور تھیٹریکل کمپنیاں اپنے اسٹیج پر نہایت شوق سے کھیلتی ہیں۔ یورپ کے ڈراموں کا بہت اچھا حصہ وہ سمجھا جاتا ہے جس میں کوئی ایکٹر تنہائی میں اپنے دل سے آپ باتیں کرتے ہوئے دلی خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ جس کی مثال شیکسپیر کے مشہور پلے ہیملٹ سے ملتی ہے۔ "مثنوی طلسم الفت" میں بھی اس قسم کا سین نہایت بے مثل طریقے سے لکھا گیا ہے۔ چنانچہ ہم نے اپنے انتخاب مثنوی میں اسی سین کو لیا ہے جہاں عالم آرا حالت انتظار میں اپنے دل سے باتیں کر رہی ہے۔ جو حسب ذیل ہے:۔

۱۱۶۔ مثنوی

حسرت دید بڑھتی جاتی ہے	وحشت عشق سر اُٹھاتی ہے
متحمل جو ہو نہ سکتی تھی	آپ ہی آپ پھر وہ بکتی تھی

ہم کو جانی بہت نہ ترساؤ / اس قدر راستہ نہ دکھلاؤ
دل بہت بے قرار ہے اب تو / آنکھوں میں جانِ زار ہے اب تو
جو جو گزرے گی سب سہونگی میں / گو ترے تک منتظر رہوں گی میں
مرض انتظار اے دلدار / ہے کل امراض سے بڑا آزار
گر مری زندگی میں آجاتے / صورت اپنی ذرا دکھا جاتے
حسرتِ دید تو نہ رہ جاتی / جو کہ کہنا تھا تم سے کہہ جاتی
ایک دن یہ کسی مصاحب نے / باتوں باتوں میں کہہ دیا اُس سے
یہ کئی دن سے ہے خبر مشہور / کسی شہزادہ کا جہاز حضور
اس طرف کو کہیں سے آیا تھا / یاں تلک آنے بھی وہ نہ پایا تھا
کہ کچھ ایسی ہوا چلی ناساز / غرق اک دم میں ہو گیا وہ جہاز
سُنتے ہی یہ سخن وہ کشتۂ غم / متوحش ہوئی کمال اُس دم
بولی گھبرا کے سچ کہہ اے خوشخو / کہیں میرا ہی وہ نگار نہ ہو
نام کیا اُس قمر عذار کا تھا / رہنے والا وہ کس دیار کا تھا

غزل ۱۱۷

ادا سے دیکھ لو جاتا رہے گلہ دل کا / بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا
وہ ظلم کرتے ہیں ہم پر تو لوگ کہتے ہیں / خدا بتوں سے نہ ڈالے معاملہ دل کا

خدا ہی خیر کرے رنگ آج بیڈھب ہے — تپک رہا ہے کئی دن سے آبلہ دل کا
وہ رند ہوں کہ مجھے ہتکڑی بھی بیعت ہے — ملا ہے گیسوئے جاناں سے سلسلہ دل کا
بہار آتے ہی کنج قفس نصیب ہوا — ہزار حیف کہ نکلا نہ حوصلہ دل کا

خدا کے سامنے اپنا ہے اے قلق انصاف
بتوں سے حشر میں ہوگا معاملہ دل کا

(۴۴) منیر سنہ ۱۸۸۱ء

سید اسمٰعیل حسین خلف سید احمد حسین صاحب شاد۔ بزرگوں کا اصلی وطن شکوہ آباد ضلع مین پوری تھا لیکن ان کا قیام عرصۂ دراز تک لکھنؤ میں رہا اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ بہ تقریب ملازمت کانپور فرخ آباد میں بھی رہے۔ آخر زمانہ میں نواب کلب علی خاں کے دربار سے منسلک ہو گئے تھے۔ رشک کے ارشد تلامذہ سے تھے۔ ناسخ سے بھی استفادۂ سخن حاصل کیا تھا۔ منیر آغاز شباب سے شاعری کے دلدادہ تھے۔ ان کے کلام میں قدیم تخیل اور الفاظ پرستی کا رنگ نمایاں ہے۔ لیکن نہایت پرگو اور مشاق شاعر تھے۔ پیدائش ذی الحجہ سنہ ۱۲۳۵ھ وفات سنہ ۱۲۹۸ھ م سنہ ۱۸۸۱ء میں بمقام رامپور ہوئی۔ کلیات مطبوعہ ہے۔ لیکن عام طور پر نہیں ملتا۔ ان کی ایک مثنوی "معراج المضامین" کے نام سے زیادہ

مشہور ہی۔ کلام یہ ہی:۔

۱۱۸۔ غزل

آمد تصوّرِ بتِ بیداد گر کی ہی
دل کی بھی لوٹ خانہ خرابی جگر کی ہی

نزدیک صبحِ رخصتِ اہلِ نظر کی ہی
اب حسنِ یار چاندنی پچھلے پہر کی ہی

دنیا میں مثلِ کاغذِ آتش زدہ ہیں لوگ
مہلت ہزار آنکھوں کو اک اک نظر کی ہی

پیری ہی صبح شامِ جوانی کے واسطے
مہمان شمعِ حسنِ بتاں رات بھر کی ہی

چاروں طرف کو اڑتے ہیں ہوش اہلِ عقل کے
یا رب ہوا دیارِ جنوں میں کدھر کی ہی

آنکھیں بچھی ہیں جال کے رستہ میں دور تک
آمد قفس کی سمت یہ کس مشتِ پر کی ہی

تقدیر کی کجی ہو کہ ٹیڑھا ہو آسمان
یہ سب عنایت آپ کی ترچھی نظر کی ہی

اک بار نیم بار کے اب تک خبر نہ لی
یا رب نگاہِ مست یہ کس بے خبر کی ہی

آباد۔ دل کی خانہ خرابی سے سب ہوئے
بستی زمانے میں اسی ویران گھر کی ہی

گو رسم و راہ خنجرِ ابرو نے قطع کی
پر تھوڑی سی لگاوٹ ابھی تک نظر کی ہی

یہ رنگ بو کہاں گلِ تر کو نصیب تھا
اتری ہوئی قبا کسی رشکِ قمر کی ہی

باقی ہی دل میں نوکِ مژہ کی ابھی کھٹک
یہ پھانس یادگار کسی نیشتر کی ہی

اطفالِ اشک تنگ ہیں گل کھیلیں کس طرح
ای آستین تجھ میں جگہ ہاتھ بھر کی ہی

دلی بگڑ کے بن گئیں اکثر ولایتیں
جس گھر میں دیکھو لوٹ اسی اجڑے گھر کی ہی

فرمانِ حسنِ گرم کے تابع ہیں نرم دل
پنبہ جہاں کہیں ہے رعیت شرر کی ہے

نامِ سلوک سے ہیں اگر کان آشنا
آوازِ خضرِ راہ ۔ ہر اک جانور کی ہے

کر بیٹھیں ترکِ عشق سراپائے یار ہم
مجبور ہیں کہ بیچ میں چاہت کمر کی ہے

رخصت طلب ہے عاشقوں سے حسن یار کا
پروانوں سے ۔ وداع چراغِ سحر کی ہے

آوارہ چھوڑ جاتی ہے جسم گلی کو روح
مٹی خراب ۔ گرد و غبارِ سفر کی ہے

قطعہ

مانندِ اختلاط ہے سہل اب کی شاعری
تیزی نہ طبع کی ہے ۔ نہ دقت نظر کی ہے

کہنا یہ ہے کہ مرتے ہیں تم پر نثار ہیں
تلخی نہ زہر کی ۔ نہ حلاوت شکر کی ہے

جو عاشقانہ شعر ہے سرکش ہے حسن سے
پردرد جو غزل ہے وہ دشمن اثر کی ہے

خالی ہے حسنِ بندش و مضموں سے یک قلم
ہر ایک بیت کوٹھڑی مفلس کے گھر کی ہے

مرغوب ہے محاورہ اربابِ شوق کا
ہاں کس میں جنسِ کمال و ہنر کی ہے

موتی کے مول ۔ قطرۂ بے مایہ بکتے ہیں
مٹی خراب آج کل آب گہر کی ہے

پھر بھی کبھی نگاہِ کرم ہوگی اس طرف
امید آج تک اسی پہلی نظر کی ہے

بزمِ سخن میں لطفِ جناب عروج سے
شہرت منیر اس غزلِ مختصر کی ہے

(۱۱۹)

وہ شریک خون جگر سے خوش دل زار(۱۱۹) موج خطر سے خوش
کوئی میرے دیدۂ تر سے خوش ہیں کسی کی ترچھی نظر سے خوش
نہ تو سینہ۔ آہِ سحر سے خوش۔ نہ فلک کی سیدھی نظر سے خوش
مرے کان تیری خبر سے خوش مری آنکھ حلقۂ در سے خوش
تری بو نہ لائی ادھر کبھی۔ مرے دل کی لی نہ خبر کبھی
صفتِ چراغِ سحر کبھی۔ نہ ہوا نسیمِ سحر سے خوش
زر سرخ کی ہو طلب جہاں وہیں اے فلک ہو گہر فشاں
کوئی طفلِ طبع نہیں یہاں جو ہو سیرِ رقصِ شرر سے خوش
نہ پھنسا کے گیسوئے حور اُسے نہ ہنسا کے صبحِ سرور اُسے
نہ خوش آئے آتشِ طور اُسے جو ہو میرے دیدۂ تر سے خوش
تہ زلف ہوش ہوئے ہرن کھلے تیری آنکھوں کے مکر و فن
شبِ تار میں ہوئے راہزن مرے قافلے کے سفر سے خوش
پھرے جاؤں تیری وفا کا دم ہوا گرچہ سر بھی مرا قلم
نہ فراقِ جان و بدن کا غم نہ وصالِ گردن و سر سے خوش
کبھی تھے یہ کوچۂ یار میں کبھی دل کے جیب و کنار میں
مرے اشک فصلِ بہار میں ہیں دامنِ گلِ تر سے خوش

فقط آبرو ہی نہ مجھ کو دو۔ نگہ غضب سے بھی کام لو
جسے آب تیغ کی پیاس ہو وہ ہو کیونکر آب گہر سے خوش

کروں دم میں قطع رہ سفر نہ ہو غم عدم میں بھی بال بھر
اُسی تیغ سے مجھے ذبح کر جو رہی ہو قرب کمر سے خوش

جسے حکم یار کا پاس ہے۔ وہی رمز فقر شناس ہے
وہ دل آبلوں سے اُداس ہے نہ حصولِ گنج گہر سے خوش

چُھٹے دل سے سیر جہان کی۔ کہ وداع تن سے ہو جان کی
نہ ہو لو بھی آپ کے کان کی خبرِ چراغ سحر سے خوش

مرے دل میں داغ وفا ہے جو۔ اُسے لاکھ طرح کا رتبہ دو
نہ کفِ کلیم سے شاد ہو نہ رہے جبین قمر سے خوش

سوئے زلف ہی نہ گزر کرے۔ رگِ جاں میں بھی کبھی گھر کرے
وُہی بَل تو جب اِدھر کرے جو ہو وصل موئے کمر سے خوش

یونہیں شبہ دل میں نہ بٹھائیے۔ مرے محو ہونے کو مانیے
اگر آنکھ جھپکے تو جانیے کہ نہیں میں برقِ نظر سے خوش

نہیں معصیت کی کچھ انتہا۔ کوئی کار نیک تو ہو بھلا
کروں اہلِ شہر کو اے خدا میں ہوائے دامن تر سے خوش

تپِ سوزِ غم کے مریض کو نہ تاب ہے نہ سرور ہے
جلے اپنی آگ میں آپ جو وہ ہو کیوں کر آتشِ تر سے خوش

مرے دل کی دیکھ کے بے بسی ہو شریکِ عالمِ بے کسی
لبِ گور تنگ رہے وہ ہنسی جو ہو دل کے زخمِ جگر سے خوش

کروں عید شدّتِ نزع کی جو دکھائیں شکل وہ چاند سی
رہیں آنکھیں خوابِ فنا میں بھی دمِ آخری کی نظر سے خوش

یہی زلف میں ہے اسیر بھی یہی تیرے در کا فقیر بھی
دلِ بیقرار منیرؔ بھی ہو کبھی کرم کی نظر سے خوش

۴۵۔ رخشاں ۱۲۸۳ھ

نواب ضیاء الدین خاں خلف فخر الدولہ احمد بخش خان بہادر دہلوی فارسی میں نیرؔ اور اردو میں رخشاں تخلص تھا۔ مرزا غالب سے قرابت کے علاوہ تلمذ کی نسبت بھی تھی۔ دہلی کے اہلِ کمال میں آپ کا دم غنیمت تھا۔ صرف شاعر ہی نہ تھے بلکہ شعر کے نقّاد بھی۔ عامیانہ خیالات اور ٹکسال باہر محاورات کو اپنے کلام سے دور رکھتے تھے۔ علمِ تاریخ کے ماہر تھے اور گزشتہ واقعات سے جو نتائج مرتب کرتے تھے وہ نہایت گراں مایہ اور قابلِ قدر ہوتے تھے۔ نواب صاحب نے

۱۲۰۳ء مطابق ۱۷۸۸ھ میں انتقال فرمایا۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ کی درگاہ میں دفن ہوئے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:-

۱۲۰۔ غزل

پی کے گرنے کا ہے خیال ہمیں — ساقیا لیجیو سنبھال ہمیں

شب نہ آئے جو اپنے وعدہ پر — گزرے کیا کیا نہ احتمال ہمیں

تیرے غصہ نے ایک دم میں کیا — مردۂ صد ہزار سال ہمیں

دل میں مضمر ہے معنیٔ باقی — کسی صورت نہیں زوال ہمیں

طالعِ بد سے شبِ رخشاں
اپنے ہی گھر میں ہے وصال ہمیں

۴۷۔ قدر ۱۸۸۴ء

مولوی غلام حسنین بلگرامی ولد سید خلف علی۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت زید شہید بن امام زین العابدین سے ملتا ہے۔ بلگرام کے باشندے تھے ۱۲۴۹ھ میں وہیں پیدا ہوئے۔ واجد علی شاہ کے عہد میں لکھنؤ تشریف لائے اور وہاں علوم عربیہ حاصل کیے۔ شاعری میں پہلے آپ سحر و برق سے اصلاح لیتے رہے ان دونوں کی وفات کے بعد شیخ امداد علی بحر ارشد تلامذہ حضرت ناسخ کے

شاگرد ہوئے غدر ۱۸۵۷ء کے بعد حضرت قدر لکھنؤ سے دہلی چلے آئے اور مرزا غالب مرحوم سے استفادہ اُٹھایا۔ آخر میں سرکار آصفیہ میں ملازم ہو گئے تھے صنائع بدائع و عروض سے بخوبی واقف تھے۔ پنگل یعنی ہندی کا عروض جانتے تھے۔ قواعد العروض اور اعجاز خسروی کا حاشیہ آپ کا لکھا ہوا موجود ہے ۲۳ ذی قعدہ ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۸۸۴ء کو لکھنؤ میں انتقال کیا۔ کلیات شائع ہو چکی ہے کلام کا انتخاب یہ ہے۔

۱۲۱ غزل

خدا کو مانو ہنسی نہ جانو نہ میرے دل پر جفا کرو تم
ہلے گا عرشِ بریں کا پایہ ذرا تو خوفِ خدا کرو تم

زمانہ اُلٹا ہی کیا کرو تم بدا جو ہے وہ ادا کرو تم
وفا کریں ہم جفا کرو تم دعا کریں ہم دغا کرو تم

سرورِ وصلت کہ رنجِ فرقت دوائے الفت کہ دردِ کلفت
نشانِ بوسہ کہ داغِ حسرت قبول ہے جو عطا کرو تم

ہمیں نے پہلے گلا کٹایا ہمیں نے قاتل تمہیں بنایا
ہمیں نے یہ رنگ سب جمایا ہمارے حق میں دعا کرو تم

ابھی کفن مردے پھاڑ ڈالیں ابھی مزاروں سے سر نکالیں
ابھی جو محشر کی چال کے چالیں ذرا قیامت بپا کرو تم

دل و جگر پلکوں پہ چھاوے تو جان قربان ہے لبوں پر
اب ایک سر ہے اُسے بھی لیکر قدم پہ اپنے فدا کرو تم

تباہ ہوگا اسی میں باہم رہے یہ دونوں طرف کا عالم
کریں تکلف نہ تم سے کچھ ہم نہ ہم سے شرم و حیا کرو تم

ہزار دل ہوں جو اسے جفا جو دریغ تم سے نہیں سر مو
اسیر گیسو قتیل ابرو شہید ناز و ادا کرو تم

لگا ہے دل ہم سے خیر بہت ہیں جو اغیار بھی مکدر
ذرا نہیں اختیار ہمیں پر پھر اُس کے بارے میں کیا کرو تم

ہماری شہ رگ پھڑک رہی ہے کہ روح اس میں اٹک رہی ہے
تمام گردن لٹک رہی ہے ابھی نہ خنجر جدا کرو تم

ہوئیں جگت آشنا نگاہیں ہیں کفر و اسلام سب جدا ہیں
ملو تم اس سے وہ جس کو چاہیں نئے نئے آشنا کرو تم

ہمارے نالوں کو سُن جو پاؤ یقین ہے غش کھا کے لوٹ جاؤ
نہ لوٹ جاؤ نہ غش میں آؤ تو وعدہ واہ وا کرو تم

بہت سے پیچ بھگکے ہوئے رہو تم کھنچے ہوا تب پڑے سے ہو تم
جو بوسے لیلیوں تو کیا کہو تم گلے لگا لوں تو کیا کرو تم

بجا ہی بجا مرا گلا تھا تمہارا اس میں گناہ کیا تھا
یہ میری تقدیر میں لکھا تھا نہ مجھ پہ جور و جفا کرو تم

بنانے والے قدر کیا کہا تھا یہ ہی نتیجہ ہی عاشقی کا
غریب و بیکس ذلیل و رسوا خراب و خستہ پھرا کرو تم

۴۷- اختر ۱۸۸۷ء

واجد علی شاہ (والی اودہ) آپ امجد علی شاہ کے خلف اکبر تھے ۱۸۴۷ء میں مسند نشین ہوئے۔ آپ کی طبیعت نہایت عیش پسند واقع ہوئی تھی فیاض بھی تھے ۱۸۵۶ء میں اودہ کی سلطنت کا انتظام گورنمنٹ انگریزی نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور آپ کو نظر بند کر کے کلکتہ بھیج دیا۔ ۱۵ لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ ملتا تھا۔ اس حالت میں بھی عیش و نشاط سے ہاتھ نہ اُٹھایا۔ گزشتہ فیاضی میں فرق نہ آنے دیا۔ ۱۳ محرم ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۷ء میں وفات پائی۔ علماء و شعرا کے قدر دان تھے۔ شاعری میں جملہ اصناف سخن پر قادر تھے۔ چھ دیوانوں کے علاوہ آپ کی مثنویاں قابل دید ہیں جن میں اپنے کارناموں کو آزادانہ طریقے سے کھلے ہوئے الفاظ میں قلم بند کیا ہے۔ فن موسیقی کے دلدادہ تھے۔

نمونۂ کلام یہ ہے:-

غزل ۱۳۲

چاک چاک اپنا گریباں نہ ہوا تھا سو ہوا — وحشت دل کا جو ساماں نہ ہوا تھا سو ہوا

رُخ ترا آتش سوزاں نہ ہوا تھا سو ہوا — دل مرا شمع شبستاں نہ ہوا تھا سو ہوا

ابر مجھ پر کبھی گریاں نہ ہوا تھا سو ہوا — گھر کبھی خانۂ زنداں نہ ہوا تھا سو ہوا

چمنِ عشق بیاباں نہ ہوا تھا سو ہوا — زخم دل خوردہ نمکداں نہ ہوا تھا سو ہوا

دردِ رنگِ رُخِ جاناں نہ ہوا تھا سو ہوا — دل کبھی طفلِ دبستاں نہ ہوا تھا سو ہوا

یا خدا دیر میں ساماں نہ ہوا تھا سو ہوا — کافرِ عشق مسلماں نہ ہوا تھا سو ہوا

جور جو گنبد گرداں نہ ہوا تھا سو ہوا — دل کبھی گنجِ شہیداں نہ ہوا تھا سو ہوا

رُخ انور سے ہیں حیراں نہ ہوا تھا سو ہوا — کبھی اسے زلف پریشاں نہ ہوا تھا سو ہوا

ظلم و جور لائے شبِ ہجراں نہ ہوا تھا سو ہوا — خانۂ گور میں مہماں نہ ہوا تھا سو ہوا

چشمِ انصاف سے طوفاں نہ ہوا تھا سو ہوا
دلِ اختر چمنستاں نہ ہوا تھا سو ہوا

۴۸ - ادیب ۱۸۹۱ء

مولوی سبط الحق ولد مولوی احسان الحق دہلوی ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے حضرت مولانا شاہ عبدالحق محدث دہلوی ان کے مورث اعلیٰ تھے - عربی فارسی اور تھوڑی سی انگریزی جانتے تھے - فن سخن میں حضرت غالب کے شاگرد تھے - شاعری کے علاوہ زبردست انشا پرداز تھے ۱۸۸۳ء میں میور گزٹ

دہلی کے ایڈیٹر ہوئے۔ اس کے بعد لاہور پہنچ کر ۱۸۸۳ء میں رفیقِ ہند کے جواب میں شفیقِ ہند جاری کیا۔ رفیقِ ہند اُس زمانہ میں جمہور مسلمین اور اُن کے مسلمہ لیڈروں کی پالیسی سے الگ ہو کر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے ہوئے تھا۔ اِس کے ظرافت آمیز مضامین نے اُس کی ہوا اکھیڑ دی۔ آخر زمانہ میں ریاست حیدرآباد سے تعلق ملازمت ہو گیا تھا وہاں بعمر ۵۴ سال ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۸۹۸ء میں انتقال ہو گیا۔ کلام کے جمع کرنے پر توجہ نہ تھی۔ اس لیے کوئی دیوان موجود نہیں ہے۔ کلام کا انتخاب یہ ہے۔

غزل ۱۲۴۳

دولتِ اشک نظر آتا ہی تلاطم مجھ کو
جستجو خاک کی ہی بہرِ تیمم مجھ کو

خود پسندی نے مجھے اور نہیں ایک کیا
کیوں مری طرح سے آتے ہو نظر تم مجھ کو

بحرِ مواج میں قطرہ کا تماشا دیکھو
ناخدا چھوڑ چلا ہی سرِ قلزم مجھ کو

خوگرِ جور ہوں الطاف و محبت معلوم
میں نہیں غیر کہ ہو لطفِ ترحم مجھ کو

دل میں خاموشی کو اک خضرِ تعلق جانا
نہ بن آئی کوئی جب طرزِ تکلم مجھ کو

دل میں برداشت نہیں رشکِ عدو کی اتنی
آپ کا لطف گوارا نہ ترحم مجھ کو

کام گھر سے نظر آتے ہیں بجلی تک کہ خدا
گردشِ دل سے اٹھے یار اٹھے تکلم مجھ کو

موجِ دریا کی شکستیں بھی نظر آتی ہیں
جوششِ گریہ نے دکھایا جو تلاطم مجھ کو

صاحبزادہ محمد صفدر علی خاں۔ خلف نواب محمد سعید خاں والی رام پور آپ رام پور کے صاحبزادوں میں خوشگو۔ عالی فکر شاعر تھے۔ حضرت امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ طبیعت میں شوخی۔ مضامین میں گرمی ہے آپ کا دیوان مطبوعہ موجود ہے جو شاعری کی دنیا میں وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے زمانۂ قتل جنرل اعظم الدین خاں میں وارد کلکتہ تھے۔ اس کے چند سال کے بعد وہیں انتقال ہوا۔ تاریخ انتقال ۲۶ جمادی الآخر ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۶ جنوری ۱۸۹۳ء ہے ۱۸ جنوری کو رام پور میں دفن ہوئے۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

غزل ۱۲۴

تھا شکایت کا جو اُن سے حوصلہ جاتا رہا
سامنا جب ہو گیا سارا گلہ جاتا رہا

فصل گل میں بیڑیاں کاٹیں عبث حداد نے
تھا جو سرکارِ جنوں سے سلسلہ جاتا رہا

وائے قسمت بیخودی میں کھو گئی تصویر یار
دل کے بہلانے کا یہ بھی مشغلہ جاتا رہا

اس قدر صدمے سہے ہم نے ترے عشق میں
دل لگانے کا کسی سے حوصلہ جاتا رہا

جام ٹوٹے اتنے دورِ چرخ مینا رنگ سے
محتسب کا شکوہ قاضی کا گلہ جاتا رہا

تھیں وہ ساری مستیاں جوشِ جنوں کا اب کہاں
سر سے وہ سودا وہ دل سے ولولہ جاتا رہا

دوستوں کے ہاتھ سے صدمے اٹھائے اس قدر		دل سے اپنے دشمنوں کا بھی گلہ جاتا رہا

عہدِ پیری میں کہاں صفدر جوانی کے وہ رنگ
وہ بہار آخر ہوئی وہ ولولہ جاتا رہا

۵۰۔ عزیز ۱۸۹۳ء

نواب حافظ عبد العزیز خاں بریلوی خلف نواب سعادت یار خاں آپ حافظ الملک حافظ رحمت خاں کے پوتوں میں تھے۔ عربی۔ فارسی میں مشرقی علوم کی تکمیل کی تھی سنسکرت بھی جانتے تھے۔ ضلع بریلی کی عدالت میں وکالت کرتے تھے۔ آپ کی ایک کتاب مجالس العلوم کے نام سے شہرت ہے جس میں تمام علوم و فنون کا بیان ہے۔ دیوان فارسی و اردو ۱۸۹۳ء میں چھپ چکا ہے ۵۰۔ برس ۸ ماہ کی عمر پا کر ۱۸۹۳ء میں انتقال کیا۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

۱۲۵۔ غزل

یا خدا دل میں غمِ یار کی مہمانی ہے
سترِ غم رکھ لے کہ بہت بے سر و سامانی ہے

عشق کا بھید چھپانے کو بنا ہوں مجنوں
پردۂ رازِ محبت مری عریانی ہے

رشکِ اگلزار کی ہے عشق کے بازار میں قید
قیمتی ہے وہی یاقوت جو رمانی ہے

راستے دیکھے ہیں ملکِ عدم کے لیکن
تیغ کے گھاٹ اتر جانے میں آسانی ہے

غذا جاں ہو دل مجروح میں کیونکر محفوظ	زخم کے چور سے دشوار نگہبانی ہی
عشق سینے میں نیا سوز تو آنکھوں میں سرشک	طرفہ شی ہی کہ کہیں آگ کہیں پانی ہی
اٹھے ہو بہم طبع ازل سے ہمراہ	چین ماتھے کی تمہارا خطِ پیشانی ہی
صدمہ پہونچا تپش دل سے تنِ نازک کو	وصل کی شب مجھے یہ اُن سے پشیمانی ہی

خرمنِ غنچۂ گل سینۂ بلبل ہی عزیز
کثرتِ زخم ہی چھالوں کی فراوانی ہی

۱۵۔ فروغ ۱۸۹۳ء

شاہزادہ میرزا قیصر بخت دہلوی خلف میرزا فادبخش صابر۔ میرزا جواں بخت کے زمانہ سے دہلی کو چھوڑ دیا تھا اور بنارس میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ہمیشہ مومن و غالب و ذوق کے مشاعروں میں شریک رہتے تھے۔ شاعری میں اپنے والد کے شاگرد تھے۔ مگر امام بخش صہبائی اور عبدالرحمن خاں صاحب احسان کو بھی اپنا کلام دکھاتے رہتے تھے۔ نہایت پر مضمون اور معنی خیز اشعار کہتے تھے صاحب دیوان تھے سنہ ۱۳۱۱ھ / ۱۸۹۳ء کے قریب انتقال ہوا کلام یہ ہی۔

۱۴۴ غزل

بڑھ گئی بعد مرے گرمیٔ وحشت میری
مثلِ سیماب اگر دل اڑتی ہے تربت میری

آپ کا عشق بھی کیا قفلِ زباں بندی ہے
نہیں کھلتی جو زباں بہرِ شکایت میری

عکس آئینۂ دل میں ہے ترے قامت کا
میرے پہلو میں ہے موجود قیامت میری

عرشِ اعظم پہ زمیں کا سرِ عزت پہنچا
اس قدر بڑھ گئی عالم میں کدورت میری

مجھ کو جز جامۂ وحشت کوئی جامہ نہ ملا
چشمِ آہو کی سیاہی ہوئی قسمت میری

ہے فروغ اپنا کلام آئینۂ غیب نما
کہ نظر آتی ہے اشعار میں فکرت میری

۵۲ فطرت ۱۸۹۵ء

سید حامد علی گورکھپور کے رہنے والے تھے۔ ایشیائی شاعری میں مغربی روح پھونکنا چاہتے تھے۔ مختلف عنوانوں پر نظمیں لکھتے تھے۔ ۴۰ سال کی عمر میں ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۸۹۵ء کے قریب انتقال ہو گیا۔

نمونۂ کلام یہ ہے

۱۲۶

جلوۂ بیگانہ

جلوہ تیرا راہِ فنا ہیں
قوت تیری دستِ دعا میں
شوخی تیری چشمِ بقا ہیں
ٹھنڈک تیری بادِ صبا میں

رنگت تیری برگِ حنا ہیں
عصمت تیری چشمِ حیا ہیں

اے تو اور کرشمہ تیرا
پردۂ وحدت پردہ تیرا
ہر اک دل میں جلوہ تیرا
بزمِ تصور کمرہ تیرا

صورت پیاری نام خدا ہی
رنگ نرالا ڈھنگ نیا ہی

تو ہی ساقی بادۂ عرفاں
غمزے تیرے فتنۂ دوراں
بستی تیری شہرِ خموشاں
پرتو تیرے سارے خوباں

چشمِ موسیٰ خلوت تیری
سب سے اوجھل صورت تیری

بزم میں تیری ہو کا عالم
شاخِ تکلم دستِ ماتم
محفل تیری چشمِ پُرنم
عاشق تیرے نالاں پُرغم

لطفِ محبت جس نے پا یا
جی مر کر کچھ لطف اٹھایا

مستی تیری چشمِ ادا ہیں
آہٹ تیری بانگِ درا ہیں

ہستی تیری رنگِ فنا ہیں
قایم تجھ سے جان حیا ہیں

ہر اک رنگ میں تو ہی تو ہی
باغ جہاں میں تیری بو ہی

پر رونق ہی بزمِ وحدت
لکھے تیرے رمزِ حقیقت

ہی آباد تجھی سے جنت
کس کی روح میں اتنی قدرت

یہ منہ ایسی باتیں فطرت
کچھ تو سوچو اپنی حقیقت

۵۳- مذاق ۱۸۹۵ء

مولوی دلدار علی بدایونی والد کا نام شیخ نثار علی صدیقی ۱۲ ربیع الاول ۱۲۳۵ھ کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ خاقانیِ ہند ذوق دہلوی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ زانوئے شاگردی تہ کرتے وقت فی البدیہہ قطعہ کہہ کر استاد کو سنایا تھا۔

کیا کہوں عرضِ اشتیاق اپنا ٭ شعر کہنا غرض تھا شاق اپنا
ذوق تھا یہ ترے تلمذ کا ٭ کہ تخلص کیا مذاق اپنا

۱۱۔ ربیع الثانی ۱۳۱۱ھ کو بدایوں میں انتقال ہوا۔ انتقال سے ۳۰ سال قبل عاشقانہ شعر کہنا چھوڑ دیا تھا۔ صرف نعت ومنقبت کہا کرتے تھے اور ذکر و شغل میں مشائخانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ کبھی اپنا دیوان مرتب کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ زمانہ شباب کے عاشقانہ کلام کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا۔ انتقال کے بعد بعض شاگردوں نے آپ کے کلام کا ایک مجموعہ مرتب کیا۔ جس میں ہر قسم کا کلام جو دستیاب ہو سکا داخل ہے۔ یہ کتاب کلام دلدار علی مذاق کے نام سے بدایوں میں طبع ہوئی ہے

نمونہ کلام درج ذیل ہے

غزل ۱۲۷

جو گرم ہے حسن اُس حسیں کا۔ نہ وہ پری کا نہ حور عیں کا
نقاب اُٹھے روئے آتشیں کا تو چاند جل جائے چودھویں کا

قلم کو زہرہ نہیں رقم کا۔ ہے دل میں دفتر بھرا الم کا
ورق ہے جو اِس کتاب غم کا۔ وہ ایک دیوان ہے حزیں کا

تلاش دیر و حرم ہے بیجا۔ کہ جا بجا ہے وہ جلوہ فرما
جہاں پہ ڈھونڈا وہیں پہ پایا۔ ہر اک مکاں ہے اُسی مکیں کا

ہوا جو طفل سرشک پیدا۔ بنا وہ جلوے میں رشک موتی
کیا تھا کچھ ہم نے وقت گریہ۔ خیال اُس چشم سرمگیں کا

مذاق کہہ دے یہ نکتہ داں سے۔ بڑھا دیا ہم نے لامکاں سے
کہا تھا ناسخ نے آسماں سے۔ بلند رتبہ گر اس زمیں کا

(۵۴) بیان سنہ ۱۹ء

سید مرتضیٰ میرٹھ کے سادات عظام سے تھے۔ نازک مزاج ایسے تھے کہ چاند سورج کی روشنی برداشت نہ کر سکتے تھے۔ ۱۴ برس کی عمر سے آخر وقت تک گوشۂ تنہائی میں گزار دی۔ زبانِ دہلی کے مقلد مگر اجتہاد کا پہلو لیے ہوئے تھے اپنے ہم عصروں میں سے کسی کو کم خیال میں لاتے اور تھے بڑے مضمون آفریں۔ قدرت نے جدت طرازی کا مادہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ ان کی تصنیفات میں چھوٹا سا مجموعۂ نعتیہ۔ اور کچھ کلام عاشقانہ ہے۔ "ایشیائی شاعری کی الوداع" نام ان کا ایک مسدس مشہور ہے۔ ساٹھ سال کی عمر پاکر ۱۳۴۱ھ مطابق سنہ ۱۹ء میں دارِ فانی سے سدھار گئے۔

نمونۂ کلام حسب ذیل ہے:

۱۲۷

امید

امید سے خطاب

کلیسا میں بت کی ادا بن گئی تو
حرم میں پہونچ کر خدا بن گئی تو

یہ پردے کی ہے بات سن لے نہ کوئی
کہ پردے میں کیا جانے کیا بن گئی تو

لگائی ہے لو تجھ سے اجڑے ہوؤں نے
اندھیرے گھروں کا دیا بن گئی تو

ہر اک رنج و غم کو کیا محو تو نے
ہر اک درد دکھ کی دوا بن گئی تو

بیاں کے سوا تو نے سب سے نبھائی
یہیں آکے بس بے وفا بن گئی تو

انتخاب از ایشیائی شاعری کی الوداع یعنی

۱۲۸

رخصت عروس

سلاطیں کا تابع رہا ہے زمانہ
اوسے طابق النعل بالنعل جانا
ہوا جس طرف ان کا توسن روانہ
نئی چال چلتا رہا ہے پرانا

اگر کاخِ دولت کی نوبت نئی ہو
تو نوبت کا ڈنکا بجا کرتا نئی ہو

شہانِ سلف کی تگاپو کہاں ہے
جہاں کو قرار ایک پہلو کہاں ہے
وہ دلّی کہاں ہے وہ اُردو کہاں ہے
خدا کی مشیّت پہ قابو کہاں ہے

مٹے کاغذی ناؤ کے کھینے والے
گئے مفت کی روٹیاں دینے والے

رہوگے ذلّ میں گرفتار کب تک
نہ عقبیٰ سے ہوگا سروکار کب تک
گھسیٹو گے تسبیح و زنّار کب تک
رہے گی یہ دنیائے غدار کب تک

جھکو جانبِ کعبہ چھوڑو بتوں کو
نہ پتھر پسیجیں گے توڑو بتوں کو

مسافر ہے انسان بحرِ فنا کا
خطر ہے سفینوں کو موجِ بلا کا
سفر چاہیے دیکھ کر رُخ ہوا کا
کہا مان لو نظم کے ناخدا کا

نہ کشتی سے گرداب میں گر پڑو تم
متلاطم حبابِ صرصر تھپیڑوں سے پھر بیٹھو تم

۵۵- امیر ۔۔۔ ۱۹۰۰ء

منشی امیر احمد مینائیؔ۔ ولادت ۱۶۔ شعبان ۱۲۴۴ھ بہ عہد شاہ نصیر الدین حیدر بمقام لکھنؤ۔ وفات ۱۹ ر جمادی الاخری ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۳ ر اکتوبر ۱۹۰۰ء بمقام حیدرآباد دکن۔ تاہبیر الدولہ مدبر الملک منشی سید مظفر علی خاں اسیر لکھنوی کے قابل فخر شاگرد ہیں اور بعد وفات استاد کے شعرائے لکھنؤ میں بجائے خود استاد اور یادگار سلف مانے جاتے تھے۔ اُن کی اور جلال کی وفات نے لکھنؤ کے معمر کہن مشق شعرا کا خاتمہ کر دیا امیر مینائی کی معلومات بڑی حد تک کافی و وافی تھی۔ زبان اُردو کی بدقسمتی تھی کہ امیر اللغات کا پورا مواد جمع تھا مگر صرف الف ممدودہ و مقصورہ کی دو جلدیں چھپنے پائی تھیں کہ آپ نے وفات پائی اور اب امیر کا ہمسر اور اُس پایہ کا محقق کوئی نظر نہیں آتا۔ ان کے شاگرد سیکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ ایک دیوان نعتیہ اور دو دیوان عاشقانہ ایک مثنوی صبح ازل اور ایک شنام ابد۔ تذکرہ انتخاب یادگار اور متعدد مسدس وغیرہ ان سے یادگار ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے:۔

ضبط کرنا دلِ حزیں نہ کہیں
چوٹ لگ جائے گی کہیں نہ کہیں

مسکرا کر وہ شوخ کہتا ہے
آج بجلی گری کہیں نہ کہیں

دل میں باتیں بھری تھیں کیا کیا کچھ
ہائے کچھ وقتِ واپسیں نہ کہیں

تڑپ اس قدر دلِ بیتاب
سہم جائے وہ نازنیں نہ کہیں

آگ ہو جاے گا وہ شوخ امیر
کھینچنا آہ آتشیں نہ کہیں

(۱۲۹)

گذشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہوں میں
مٹا ہوا سا نشانِ سرِ مزار ہوں میں

پھر اُس کی شانِ کریمی کے حوصلے دیکھے
گناہ گار یہ کہدے گناہ گار ہوں میں

پڑا ہی دستِ اجل مجھ پہ لاکھ بار مگر
نکل گیا ہوں تڑپ کر وہ بے قرار ہوں میں

کچھ آج میں نے نہیں پی ہی حضرتِ واعظ
ازل کا مست و پرانا شراب خوار ہوں میں

نگاہِ قہر سے مجھکو نہ دیکھ ای دوزخ
خبر نہیں تجھے کس کا گناہ گار ہوں میں

وہ کشتہ ہوں کہ مری لاش جس طرف گذرے
زمیں پکار اُٹھے قابلِ مزار ہوں میں

وہ بے قرار ہوں دیکھے اگر تڑپ میری
قرار بھی یہ پکارے کہ بے قرار ہوں میں

بڑے مزے سے گزرتی ہی بیخودی میں امیر
خدا وہ دن نہ دکھاے کہ ہوشیار ہوں میں

۵۶۔ احمدی سنہ ۱۹ء

نواب غلام احمد صاحب احمدی مرحوم یکم جنوری سنہ ۱۸۳۹ء کو بمقام کنجپورہ ضلع کرنال

پیدا ہوئے۔ خاندان کنجپورہ جس کے نواب صاحب مرحوم ایک ممتاز رکن تھے پنجاب کے مشہور تاریخی خاندانوں میں سے ایک ہے۔ اس خاندان کے مورث اعلیٰ نواب نجابت خاں صاحب تھے۔ جو ۱۷۳۰ء کے قریب افغانستان سے آئے تھے۔ اور جنھوں نے ضلع کرنال اور انبالہ میں ایک علاقہ پر حکومت حاصل کر کے کنجپورہ کو آباد کیا تھا۔ جو اس وقت تک ریاست کنجپورہ کا صدر مقام ہے۔ نواب غلام احمد خاں صاحب مرحوم ابتدائے عمر سے علمی مذاق رکھتے تھے اور بچپن ہی سے ان کو شعر و شاعری اور تصنیف کا شوق تھا چنانچہ دس برس کی عمر میں انھوں نے ایک قصہ بنام "قصۂ کرشن" نظم میں لکھا تھا عربی اور فارسی کی تکمیل کے بعد ایک مدت تک نواب صاحب نے ملک میں سیر و سیاحت کی اور اس کے بعد ایک عرصہ تک ریاست ٹونک میں مختلف عہدوں پر ممتاز رہے۔ ۱۸۷۱ء میں ریاست گوالیار میں ملازم ہوئے اور مہاراجہ جیاجی راؤ نے ضلع بھیلسہ گڑھ کا انتظام ان کے سپرد کیا جس کی یاد آج تک وہاں کی رعایا کے زبان زد ہے۔ ۱۸۸۶ء میں مہاراجہ جیاجی راؤ کی وفات پر گوالیار میں جب کونسل آف ریجنسی قایم ہوئی اس وقت ریاست کے تمام مسلمان عہدہ داروں میں سے گورنمنٹ نے صرف نواب صاحب کے سپرد اول صیغہ جوڈیشل اور بعد کو صیغہ تعلیم کیا۔ جس کے متعلق ان کی خدمات آج تک ریاست میں مشہور ہیں اور جس کے اعتراف میں ۱۸۹۴ء میں گورنمنٹ ہند کی طرف سے "نواب" کا خطاب مرحمت ہوا۔ ۱۸۹۶ء میں کونسل کی مدت ختم ہونے پر نواب صاحب فرایض منصبی سے سبکدوش ہو گئے اور آخر وقت تک

خیر کے کاموں میں مصروف رہے۔ ۱۶ر اپریل ۱۹۰۱ء کو ۶۲ سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ باوجود جلیل القدر عہدوں کی ذمہ داریوں میں مصروف رہنے کے کبھی اپنے علمی مشاغل سے دست بردار نہ ہوے۔ خط و خال کی شاعری جوانی ہی میں ترک کر دی تھی۔ توحید اور اخلاق اور سوشل مضامین پر نثر اور نظم میں ان کی تصانیف موجود ہیں۔ جن میں "مثنوی ہفت راز" "اثبات حق" اور "صبح نور" کو خاص شہرت حاصل ہی۔

(۱۳۰)

نشاں کیا کیا دکھاے تو نے یارب بے نشاں ہوکر
عیاں کیا کچھ کیا ہی تو نے ای خالق نہاں ہوکر
تمنّا ہی ترے دریوزہ گر کی تجھکو پہچانے
ترے در تک پہنچ جاے غبارِ جسم و جاں ہوکر
گلستاں میں گلوں کے کان ہیں آواز پہ تیری
ترا ذکرِ خفی کرتا ہی ہر پتّا زباں ہوکر
ترا جوش کرم رفعت اگر دے اہلِ پستی کو
مہ خور پہ زمیں سایہ فگن ہو آسماں ہوکر
تمنّا ہی سراپا محوِ ذکرِ ذاتِ باری ہوں
مرا ہر موے تن سرگرم مدحت ہو زباں ہوکر
تماشوں میں تری قدرت کے آنکھیں محوِ حیرت ہیں

نرالا رنگ ہے پیشِ نظر گزرے اجنساں ہوکر
جنھیں طفلی میں صرفِ بازیِ چوگان و گو پایا
وہی محوِ خود آرائی نظر آئے جو اں ہوکر
تنِ عریاں کو ملبوسِ عنایت کی تمنّا ہے
لباسِ جسم پھٹ جائے گا اک دن دھجیاں ہوکر
کہاں کا ضبط کیسا ننگ جوشِ یادِ باری میں
دلِ بیتاب پہلو سے نکل بھاگا فغاں ہوکر
زباں کو میری گویا کر الٰہی اپنی مدحت میں
کروں مردہ دلوں کو زندہ دل معجز بیاں ہوکر
ترے آثارِ قدرت پر کروں دلچسپ تقریریں
جھکاؤں گردنیں پیرانِ پیکر کی جواں ہوکر
کمر کستا ہوں تیرے نام پر تو مجھکو ہمت دے
سہارے پر ترے اُٹھتا ہوں تیرا مدح خواں ہوکر
جہاں بھولوں بتا جب جا بہک جاؤں ہدایت کر
جو ہو لغزش تو مجھکو تھام میرا مہرباں ہوکر
بھروسے پر تری امداد کے بیڑا اُٹھایا ہے
فلک کے بوجھ اُٹھانے پر تلا ہوں ناتواں ہوکر

ترے در پہ جبیں اکثر ہی سرگرم سجدہ ہی
تمنا ہی یہیں رہجائے خاک آستاں ہوکر

۵۶ مجروح ۱۹۰۲ء

میر مہدی حسین خلف میر حسین فگار دہلوی۔ میرزا غالب کے ارشد تلامذہ میں میں سے تھے۔ حالی۔ داغ۔ انور۔ ظہیر کے ہم عصر تھے چنانچہ مولانا حالی فرماتے ہیں۔

داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنوگے کبھی بلبل کا ترانہ ہرگز

اُردوئے معلیٰ میں ان کے نام میرزا صاحب نے بہت سے خطوط لکھے ہیں دور موجودہ میں نازک خیال اور معنی یاب شاعر تھے۔ مگر زمانہ کی ناقدری نے اُنھیں دہلی سے باہر نہ نکلنے دیا۔ ۱۳۲۰ھ ۱۹۰۲ء میں بہ مقام دہلی انتقال ہوا ان کا دیوان ۱۸۹۹ء میں شایع ہوا غالب کے رنگ میں قدیم طرز کی شاعری کرتے تھے۔

۱۳۱ غزل

کیا زلیخا ہو خوش گلستاں میں
دل تو اس کا پڑا ہی زنداں میں

یہ نزاکت اور اس پہ غیروں سے
کیسی مضبوطیاں ہیں پیماں میں

تھی وہ مجنوں کے دم ہی تک رونق
خاک اُڑتی ہی اب بیاباں میں

ولولہ خیز ہی نسیمِ بہار / چپ ہوں کیوں بلبلیں گلستاں میں

کس کو معلوم جان کب نکلی / محو بیٹھے ہم تو یادِ جاناں میں

وہ نگاہیں ہیں رخنہ گرای شیخ / میرے سینے میں تیرے ایماں میں

ہاں سبک دستیِ جنوں ہشیار / تار باقی رہے نہ داماں میں

دل خراشی ہو یا جگر سوزی / کچھ تو ہو شغل روزِ ہجراں میں

دردِ دل کی نہیں دوا مجروح
آپ ناحق ہیں فکرِ درماں میں

(۵۷) زکی ۱۹۰۳ء

سید محمد زکریا خاں صاحب خلف سید محمود خاں۔ نبیرۂ نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں سرور دہلوی مولف "تذکرہ شعرائے اردو سادات کشمیر سے تھے۔ ۱۸۳۹ء کو دہلی میں پیدا ہوئے فن شاعری میں مرزا غالب کے شاگرد تھے ان کو مرزا نے اپنی تحریر میں جو زکی کے مطبوعہ دیوان میں شامل ہی اچھا شعر کہنے والا اور اپنا شاگرد رشید لکھا ہی۔ الہ آباد۔ بریلی۔ گورکھ پور اور آخر عمر میں بدایوں میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے وہیں ۱۹۰۳ء میں وفات پائی اور حضرت سید احمد صاحب رح والد نظام الدین اولیا رح کی درگاہ میں دفن ہوئے کلام یہ ہی۔

(۱۳۲)

اسیری میں تماہی رونق کاشانہ ہوجاے
قفس ہی نالوں سے جل کر چراغ خانہ ہوجاے

تغافل سانہ گار شوق اہل درد کیا ہوگا
ادا سے دو فریب ایسا کہ دل دیوانہ ہوجاے

نہ کہنا غیر سے قاصد کہ میں مطلب نہیں سمجھا
پیام یار ہی یعنی بیگانہ ہو جاے

بنیں کیوں حضرت موسیٰ کی بیتابی ہم سپرو
کہ راز دل زباں پر آے اور افسانہ ہوجاے

خدا بزم جہاں میں دے وہ ذوق بادہ آشامی
کہ دور چرخ مجھکو گردش پیمانہ ہوجاے

پھروں کیوں اس کی بزم یار سے محروم جانبازی
فیق شوق یارب ہمت مردانہ ہوجاے

کہاں تک ضبط بیتابی دل مسکین مجھکو ہی
تری خو سے تحمل سے وہ بے پروا نہ ہوجاے

تماشا عام ہوگا اور کیف بے خودی ارزاں
عجب کیا ہی قیامت صحبت مستانہ ہوجاے

ادائے حسن میں ہو دخل انداز محبت کو
دل صد چاک اس کے گیسوؤں کا شانہ ہوجاے

جنون عشق بھی ہی علم حکمت ورنہ کیا معنی
جو دیوانہ ترا ہو جاے وہ فرزانہ ہوجاے

فغاں کرتے ہوے جا پہونچا اس کی بزم عشرت میں
کبھی تو اے زکی یہ شوخی رندانہ ہوجاے

(۱۳۳)

ہوا میں برا کی برائی تمھاری
بگڑتے ہو کیوں تم بن آئی تمھاری

مرے ایک نالے میں گھبرا لیے
ہوئی کیا ستم آزمائی تمھاری

نہ مجھ سے چھٹے گی نہ تم سے چھٹے گی	محبت مری بے وفائی تمہاری
ملو بھی تو وحشت ہیں کیوں کر ملوں میں	بجا ہے یہ نا آشنائی تمہاری
مرے اضطراب و قلق کی کشش کیا	یہاں تم کو شوخی ہی لائی تمہاری
وہ زلفیں کھلیں گی کہیں حضرت دل	ہوئی سخت مشکل رہائی تمہاری

حسینوں کو چھپ چھپ کے تم دیکھتے ہو
زکی دیکھ لی پارسائی تمہاری

(۵۰) داغ ۱۹۰۵ء

نواب میرزا خان دہلوی شاگرد رشید ذوق دہلوی ولادت دہلی محلہ بلیماران ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۸۳۱ء وفات حیدرآباد دکن میں بتاریخ ۹ ذی حجہ ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۵ فروری ۱۹۰۵ء یوم الجمعہ ان کے حالات اس قدر شہرت پذیر ہیں کہ حاجت تحریر سے بے نیاز ہیں انھوں نے اپنی زندگی ہی میں وہ ناموری حاصل کی کہ کسی کو کم نصیب ہوئی ہوگی تقدیر پیرانہ سالی میں ایسی چمکی کہ عہد سلطنت مغلیہ میں کسی کسی خوش تقدیر استاد کے ساتھ زمانہ موافقت کرجاتا تھا حضور نظام سادس بادشاہ دکن کی قدردانی اور تلمذ نے ان کو چار چاند لگادیے متاخرین دہلی میں ایسی اچھی زبان ایسی حاضر طبیعت ایسی دل پذیر غزل گوئی سنا یہی

کسی کو ملی ہو لیکن مشقی نے ان کو تبحر علمی اور زبان عربی و فارسی کی مہارت سے بے نیاز کر رکھا تھا اچھے اچھے اساتذۂ عصر کا کلام مشاعرے میں ان کے مقابل سرسبز نہ ہوتا تھا یہ کچھ تو کلام کی برجستگی سادگی جذبات و تخیل کی خوبی تھی اور کچھ پڑھنے کا انداز ایسا اعلیٰ ترین تھا کہ بایہ و شایہ اپنے استاد کی غزل قلعہ کے مشاعرے میں ہی پڑھا کرتے تھے اس لیے کہ استاد کو جہاں پناہ (ظفر) کی غزل پڑھنی ہوتی تھی ایک مثنوی فریاد داغ کہ یہ نام تاریخی ہے سنہ ۱۳۰۰ھ میں تصنیف کی چار دیوان شایع ہو کر قبول عام حاصل کر چکے ہیں اور بچے بچے کی زبان پر ان کا کلام ہے یہاں بطور نمونہ تھوڑا سا کلام پیش کیا جاتا ہے۔

۱۳۴۔ غزل

غم سے کہیں نجات ملے چین پائیں ہم — دل خوں میں نہائے تو گنگا نہائیں ہم

جورِ فلک سے خاک بھی لذت نہیں رہی — جی چاہتا ہے تیری جفائیں اٹھائیں ہم

ڈر ہے نہ بھول جائے وہ سفاک روزِ حشر — دنیا میں لکھتے جاتے ہیں اپنی خطائیں ہم

ناراض ہو خدا تو کریں بندگی سے خوش — معشوق روٹھ جائے تو کیونکر منائیں ہم

یہ اور کوئے یار کے چکر نہ ہے نصیب — لیتے ہیں اپنے پاؤں کی اکثر بلائیں ہم

تاثیر کو سلام کریں دونوں ہاتھ سے — جس وقت اپنے ہاتھ دعا کو اٹھائیں ہم

سونپا تمہیں خدا کو چلے ہم تو نامراد — کچھ پڑھ کے بخشنا جو کبھی یاد آئیں ہم

یہ جان تم نہ لوگے اگر آپ جاے گی
اس بے وفا کی خیر کہاں تک منائیں ہم

مانو کہا جفا نہ کرو تم وفا کے بعد
ایسا نہ ہو کہ پھیر لیں اُلٹی دعائیں ہم

تو بھولنے کی چیز نہیں خوب یاد رکھ
ای داغ کس طرح تجھے دل سے بھلائیں ہم

(۱۳۵)

لذت سیر دگر چشم تمنا لے گی
ایک بار اور بھی دنیا ابھی پلٹا لے گی

شکوۂ دہر نہ بیداد فلک کی فریاد
حشر میں خالق خدا نام تمہارا لے گی

لٹ چکے جان و دل و صبر و خرد و روز وصال
کیا دھرا ہی شب غم آکے یہاں کیا لے گی

ایک مدت سے ہی برباد ہماری مٹی
دیکھیے کب ترے دامن کا سہارا لے گی

چین سے آپ رہیں کچھ مری پروا نہ کریں
کیا شب ہجر بلا ہی جو مجھے کھا لے گی

دل کا سودا تری زلفوں سے بنا رکھا تھا
کیا خبر تھی کہ نگہ مفت میں ہتیا لے گی

کام بگڑا نہ بنانے سے بنے گا ہرگز
میری تدبیر نہ تقدیر سے بدلا لے گی

شاہ دیندار کا وہ فیض ہی جاری ای داغ
حشر تک جس سے مزے دین دنیا لے گی

(۱۳۶)

ای فلک چاہیے جی بھر کے نظارا ہم کو
جا کے آنا نہیں دنیا میں دوبارا ہم کو

کبھی ایما نہ کنایہ نہ اشارہ ہم کو
کم نگاہی نے تری جان سے مارا ہم کو

ہم کسی زلفِ پریشاں کی طرح اے تقدیر
خوب بگڑے تھے مگر خوب سنوارا ہم کو

جب کھنچے اُن سے ہوئے اور زیادہ مضطر
مرضِ عشق کے پرہیز نے مارا ہم کو

شکر صد شکر کہ اب قبر میں ہم جا پہونچے
توسنِ عمر نے منزل پہ اوتارا ہم کو

روز تکرار کرے کون خریداروں سے
دل کی اس گرمیِ بازار نے مارا ہم کو

چل تو اے دل رہِ الفت میں کہیں [illegible]
ل رہے گا کوئی اللہ کا پیارا ہم کو

اب تو ہم تذکرۂ غیر پہ آفت ٹھہرے
پھر قیامت ہیں جو چھیڑوگے دوبارا ہم کو

باتیں اس آئینہ رو کی بھی ہیں گویا کہ طلسم
آج تو خوب ہی شیشے میں اُتارا ہم کو

آپ سے اب نہ بنے گا کوئی سودا اپنا
پھیر دیجے دلِ بیتاب ہمارا ہم کو

ہم سیہ رو ہیں سوا مردمکِ چشم سے بھی
پر جو دیکھے تو کہے آنکھ کا تارا ہم کو

بدسلوکی میں مزہ کیا ہے مزہ ہے اس میں
کہ ہمارا ہو تمہیں پاس تمہارا ہم کو

بحرِ ہستی میں ہوئے کشتیِ طوفانی ہم
نہیں ملتا کہیں اے ولؔ کنارا ہم کو

(۱۳۷)

ثباتِ بحرِ جہاں میں اپنا فقط مثالِ حباب دیکھا
نہ جوش دیکھا نہ شور دیکھا نہ موج دیکھی نہ آب دیکھا

ہماری آنکھوں نے بھی تماشا عجب عجب انتخاب دیکھا
بُرائی دیکھی بھلائی دیکھی عذاب دیکھا ثواب دیکھا
نہ دل ہی ٹھہرا نہ آنکھ جھپکی نہ چین دیکھا نہ خواب آیا
خدا دکھائے نہ دشمنوں کو جو دوستی میں عذاب دیکھا
طرب میں جس سے ہے جان محزوں اُسی کو گردش وہی ہے پرخوں
کہ چرخ زن مثل دورِ گردوں مدام جامِ شراب دیکھا
نظر میں ہے تیری کبریائی سما گئی تیری خود نمائی
اگرچہ دیکھی بہت خدائی مگر نہ تیرا جواب دیکھا
پڑے ہوئے تھے ہزاروں پردے کلیم دیکھو تو جب بھی غش تھے
ہم اُس کی آنکھوں کے صدقے جس نے وہ جلوہ یوں بے حجاب دیکھا
جو راہ میں تیری آکے بیٹھے وہ فکرِ دیر و حرم سے چھوٹے
کہ تیرے کوچے کے ساکنوں نے بہشت میں بھی عذاب دیکھا
یہ دل تو اے عشق گھر ہے تیرا کہ جس کو تو نے بگاڑ ڈالا
مکاں سے تا لامکاں جو دیکھا تجھی کو خانہ خراب دیکھا
سرور و عیش و نشاط کیسے بدل گئے رنگ ہی جہاں کے
سُنا نہ کانوں سے تھا جو ہم نے وہ آنکھوں سے انقلاب دیکھا
جو تجھکو پایا تو کچھ نہ پایا یہ خاکدان ہم نے خاک پایا

جو تجھکو دیکھا تو کچھ نہ دیکھا تمام عالم خراب دیکھا
شراب غفلت سے داغ غش تھے دکھائے غفلت نے کیا تماشے
کہ سوتے سوتے جو چونک اٹھے مگر کوئی تم نے خواب دیکھا

(۱۳۸)

ستم ہی کرنا جفا ہی کرنا نگاہ الفت کبھی نہ کرنا
تمھیں قسم ہی ہمارے سر کی ہمارے حق میں کمی نہ کرنا
ہماری میت پہ تم جو آنا تو چار آنسو بہا کے جانا
ذرا رہے پاس آبرو بھی کہیں ہماری ہنسی نہ کرنا
کہاں کا آنا کہاں کا جانا وہ جانتے ہی نہیں رسمیں
وہاں ہے وعدہ کی بھی یہ صورت کبھی تو کرنا کبھی نہ کرنا
لیے تو چلتے ہیں حضرت دل تمھیں بھی اس انجمن میں لیکن
ہمارے پہلو میں بیٹھ کر تم ہمیں سے پہلو تہی نہ کرنا
تمھیں ہے آسان قتل ان کا یہ سخت جاں بھی بری بلا ہیں
قضا کو پہلے شریک کرنا یہ کام اپنی خوشی نہ کرنا
ہلاک انداز وصل کرنا کہ پردہ رہجائے کچھ ہمارا
غم جدائی میں خاک کر کے کہیں عدو کی خوشی نہ کرنا
مری تو ہے بات زہر ان کو وہ ان کے مطلب ہی کی نہ کیوں ہو

کہ اُن سے جو التجا سے کہنا غضب ہے اُن کا وہی نہ کرنا

ہوا ہے گر شوق آئینہ سے تو رخ رہے راستی کی جانب
مثال عارض صفائی رکھنا برنگِ کاکل کجی نہ کرنا

وہ اک ہمارا طریقِ الفت کہ دشمنوں سے بھی مل کے چلنا
یہ ایک شیوہ ترا ستمگر کہ دوست سے دوستی نہ کرنا

ہم ایک رستہ گلی کا اُس کی دکھا کے دل کو ہوئے پشیماں
یہ حضرت خضر کو جتا دو کسی کی تم رہبری نہ کرنا

بیانِ دردِ فراق کیسا کہ ہے یہاں اپنی یہ حقیقت
جو بات کرنی تو نالہ کرنا نہیں تو وہ بھی کبھی نہ کرنا

مدار ہے ناصحو تمہیں پر تمام اب اُس کی منصفی کا
ذرا تو کہنا خدا لگی بھی فقط سخن پروری نہ کرنا

بُری ہے اے داغ راہِ الفت خدا نہ لیجائے ایسے رستے
جو اپنی تم خیر چاہتے ہو تو بھول کر دل لگی نہ کرنا

(۵۹) محسن ۱۹۰۵ء

مولوی محمد محسن خلف مولوی حسن بخش علوی - آپ قصبہ کاکوری کے ایک شریف

خاندان کے رکن تھے جو عہد ماضیہ میں علمی اعتبار سے نامور تھا اور اس کے فضل و کمال کا تمام ہندوستان میں شہرہ تھا ۱۲۴۲ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی کلام جوانی میں مولوی ہادی علی صاحب شاگرد برق لکھنوی کو دکھایا اس کے بعد نعت گوئی میں طرز خاص کے موجد ہوگئے۔ اور دور حاضرہ کے شعرا میں ایک فرد کامل تھے بنارس میں وکالت کرتے تھے ۱۸ صفر ۱۳۲۳ھ مطابق ۲۴ اپریل ۱۹۰۵ء میں وہیں آپ کا انتقال ہوگیا۔ زبان کی صفائی کے ساتھ کلام سوز و گداز اور جذبات سے پر ہوتا ہے۔ نمونہ یہ ہے۔

عشق و محبت کی دلچسپی کا نقشہ
(۱۳۹)

ایک نظر مہر کی مجھ پر ساقی
مہرباں تشنہ لبوں پر ہو جا

کشتی مے نہ چلے میرے بغیر
کر دے سرشار مجھے جی بھر کے

گردش جام شراب اے ساقی
غرق کرتا ہے تلاطم مجھ کو

یہ بھی اک وقت ہے بے ڈھب ساقی
چھینٹے دے دے کے رلاتا ہے مجھے

ماہرو آئینہ پیکر ساقی
دل کی لہروں کا سمندر ہو جا

میرے دریا تیرے بیڑے کی خیر
دے صراحی پہ صراحی بھر کے

دم پہ آبے دم آنے ساقی
آج اللہ کوئی خم مجھ کو

پار کرتا ہے مخاطب ساقی
غیر بن بن کے بناتا ہے مجھے

ہیں یہ کیا رنگ تمھارے محسن
سست کیوں ہو مرے پیارے محسن

نہ وہ صورت نہ وہ سیرت تیری
یار کیا ہو گئی حالت تیری

اڑ گیا رنگ ترا بو ہو کر
بہ گیا خونِ دل آنسو ہو کر

حیف حالت تری دکھ پائی ہوئی
ہائے صورت تری مرجھائی ہوئی

لب پہ آئے ہوئے نالے پیہم
ڈبلا پائی ہوئی آنکھیں پرنم

چہرہ ڈوبا ہوا حیرانی میں
عرق آیا ہوا پیشانی میں

زردی چھائی ہوئی رخساروں پہ
سرسوں پھولی ہوئی انگاروں پر

مردنی چھائی ہے چہرہ دیکھو
اپنی جائی ہوئی دنیا دیکھو

چھپ گیا چاند ستارا ہو کر
اڑ گیا آئنہ پارا ہو کر

ہر دم اک رنگ بدلتا ہے کیوں
شمع کی طرح سے جلتا ہے کیوں

یہ انگرکھے ترے گلکاری کے
جن کی کلیوں میں چھپے ہیں کانٹے

کامدانی کا پہننا چھوڑا
لٹ گیا تیرا شہانا جوڑا

رنگ اڑا اڑ کے بکھر جانے لگا
ناتوانی کو بھی غش آنے لگا

بند آنکھیں کیے روتے دیکھا
رات ہم نے تجھے سوتے دیکھا

کس بلا کا تو ہوا ہے مجنوں
لیلیٰ کہتی ہے بلائیں لیلوں

کوہ پر جا کے اگر سر مارے
کوہکن بھی تجھے پتھر مارے

باتیں کرتے ہو تو رک جاتے ہو
آپ ہی چھیڑ کے شرماتے ہو

کبھی ملتے ہو تو بیگانے سے — کبھی ہنستے ہو تو دیوانے سے

شہر کا سیر و تماشا چھوڑا — چاندنی چوک کا رستا چھوڑا

رکھ دیے موسم گل میں کیونکر — طاق نسیاں پہ سہرے ساغر

آشنا گل کے نہ سوسن کے رہے — باغ میں تم تو خزاں بن کے رہے

بیٹھے جنگل میں نہ یکسو ہوکر — کالے کوسوں پھرے آہو ہوکر

نجد میں تیرا گلا ہوتا ہے — قیس لیلیٰ پہ خفا ہوتا ہے

کسی بت نے تجھے حیران کیا — کسی کافر نے مسلمان کیا

بیٹھے بٹھلائے یہ سودا تجھ کو — کیا ہوا میرے کنھیا تجھ کو

دیکھ بھر آئیں تری پھر آنکھیں — یاد آئیں کسے کافر آنکھیں

خون میں ڈوبی نگاہیں کیسی — ہیں مری جان یہ آہیں کیسی

بگڑی کیوں اے مرے بسمل چتون — یاد آئی کوئی قاتل چتون

عشق گیسو نے یہ عقدہ کھولا — سر پہ چڑھ کر ترے جادو بولا

جال پھیلائے ہیں منتر والے — بال کھولے ہوئے گھونگر والے

جان سے لیتے ہیں نکھرنے والے — تم سلامت رہو مرنے والے

دل لگا ہے تو پشیمانی کیوں — جان کی فکر مرے جانی کیوں

آبرو کی تجھے پروا کب تک — ننگ و ناموس کا کھٹکا کب تک

ہوش میں آؤ سمجھ والے ہو — تم تو بن مے پیے متوالے ہو

تو کہیں آیا نہ مانی آخر	مٹ گئی تیری جوانی آخر
چاندنی پچھلے پہر کی کب تک	روشنی شمع سحر کی کب تک
دل ناشاد کو رکھتا ہوں	نہ سہی یار نہ ہو پہلو میں
بس مجھے آتے ہیں چکر ساقی	لے مرے ہاتھ سے ساغر ساقی
ہاتھ لینا مجھے غش آتا ہے	دل کہیں اور لیے جاتا ہے
تیری محفل کا یہی طور رہے	دور جب تک رہے یہ دور رہے

(٦٠) ارشد ۱۹۰۶ء

ارشد صاحب عالم میرزا عبدالغنی گورگانی دہلوی خلف میرزا علی بہادر سلسلۂ نسب حضرت احمد شاہ بادشاہ تک پہونچتا ہے۔ آپ کی پیدائش قلعۂ دہلی میں ہوئی۔ غدر میں چھ سات برس کی عمر تھی شاہزادہ میرزا قادر بخش صاحب سے علم عروض حاصل کیا اور فن سخن میں ان کے شاگرد ہوگئے شاعری کے علاوہ فن موسیقی میں کامل استاد تھے۔ مرثیہ سلام پڑھنے کا شوق تھا۔ تاریخ گوئی میں کامل تھے طرز قدیم کے علاوہ جدید طرز میں بھی نظم لکھتے تھے۔ سررشتۂ تعلیم پنجاب میں ملازم تھے ان کی عمر کا زیادہ حصہ فیروزپور میں گزرا تھا ۱۲ فروری ۱۳۲۴ھ ۱۹۰۶ء کو ملتان میں انتقال کیا کوئی دیوان نہیں چھپا

١٢٨ - غزل

الٰہی جان دی ہے میں نے کس کے روئے روشن پہ

ہزاروں شمعیں پروانہ بنی ہیں میرے مدفن پر
اُگا ہی پنجۂ مرجاں جو اپنی خاک مدفن پر

تو وقتِ فاتحہ ہی بدگماں کا ہاتھ دامن پر
تعجب کیا خمیدہ ہو اگر تلوار قاتل کی

چڑھا ہی خون کس کس نے گنہ کا اس کی گردن پر
وہ نے انصاف اور اپنی وفا کی داد یا قسمت

گمانِ دوستی ہی سادگی سے ہم کو دشمن پر
نہیں کھلتا نہیں کھلتا کہ مجھ سے کیا رکاوٹ ہی

کہ کچھ رک رک کے چلتی ہی تری تلوار گردن پر
عجب اُس جلوۂ یکتا میں نیرنگِ تماشا ہی

نئی صورت سے چمکا خاطرِ شیخ و برہمن پر
میں ہوں مرہونِ منت صلح کل کا جب سے ای ارشد

یقینِ دوستی ہونے لگا ہی مجھ کو دشمن پر

(۶۱) راسخ ۱۹۰۷ء

مولوی عبدالرحمٰن دہلوی۔ خلف مولوی محمد حسین ان کا خاندان قصبہ ہنت ضلع

سہارن پور سے دہلی آکر آباد ہوا تھا۔ ان کے والد خاقانی ہند ذوق کے شاگرد تھے راسخ نے اپنے والد سے استفادہ حاصل کیا آپ صرف شاعر ہی نہ تھے بلکہ اخبار نویس بھی تھے ظرافت پسند طبیعت پائی تھی جس کی وجہ سے ظریف اخبارات کی ایڈیٹری کرتے رہے۔ قادر الکلام شاعر تھے ۲۹ ستمبر ۱۹۰۸ء ۱۳۲۶ھ کو بعمر ۴۴ سال فوت ہوئے۔ دو دیوان چھپ چکے ہیں۔

غزل ۱۳۱

کہاں تھے شب ادھر دیکھو حیا کیوں ہے نگاہوں میں
اگر منظور ہے رکھ لو مجھے جھوٹے گواہوں میں

سیہ کاری مری بن جائے رشک گیسوئے خوباں
قیامت کو چھپا بیٹھا رہوں یا رب گناہوں میں

موحد وہ ہوں گر میں سِرّ وحدت کان میں کہدوں
مؤذّن بت کدہ میں ہوں برہمن خانقاہوں میں

نظر مجھ سے چُرا کر مُنہ چھپا کر کہتے جاتے ہیں
کہ یہ چوری بھی لکھی جائے گی تیرے گناہوں میں

تعجب کیا ہے نکلے کوئی دن میں مانگ بھی ٹیڑھی
غضب کا بانکپن دیکھا ہے ہم نے کج کلاہوں میں

نہ میں عرشِ بریں پر ہوں نہ میں فرشِ زمیں پر ہوں
مری ہستی ہے گویا نیستی میری نگاہوں میں

لبوں کے بوسے دے کر عدو کو کیوں مکرتے ہو
زباں شامل نہ ہو جائے کہیں جھوٹے گواہوں میں

عدو دل جل کے گر مجھ سے کریں نالے تو اچھا ہے
ملے دادِ ستم ایک اگر ہو دادخواہوں میں

حجابِ دیدۂ خود بیں، حجابِ خاطرِ بد بیں
پڑے رہتے ہیں یہ پردے تمھاری جلوہ گاہوں میں

ہماری طرح تم پر بوالہوس مر کیوں نہیں جاتے
اگر ہیں جاں نثاروں میں اگر ہیں دادخواہوں میں

دبا کر رکھ لیا ہے چال میں محشر کے فتنوں کو
جگا کر رکھ لیا ہے شوخ نے جادو نگاہوں میں

جگر بھی خوش ہے دل بھی خوش کہیں بیٹھیں کہیں نکلیں
غضب کی میٹھی چھریاں ہیں تری نیچی نگاہوں میں

وہی راسخ تو ہیں کل تک جو میخانے کے درباں تھے
بنے بیٹھے ہیں حضرت چار دن سے دیں پناہوں میں

(۶۲) شہباز ۱۹۰۸ء

مولوی سید محمد عبدالغفور خلف سید طالب علی ضلع پٹنہ کے رہنے والے تھے ابتدا سے مضمون نگاری کا شوق تھا اخبار دارالسلطنت و اُردو گائڈ کلکتہ کے ایڈیٹر رہے تھے۔ اس کے بعد ریاست حیدرآباد میں تعلق ہوگیا، یہاں اورنگ آباد کالج میں پروفیسری کے عہدے پر ممتاز رہے بھوپال میں سررشتہ تعلیم کے ڈایرکٹر رہے اُردو کے علاوہ فارسی زبان میں بھی برجستہ شعر کہتے تھے آپ اخبار اودھ پنچ لکھنؤ کے ممتاز نامہ نگاروں میں تھے آپ کی نظم کا مجموعہ خیالات شہباز کے نام سے ۱۹۱۵ء میں نظامی پریس بدایوں میں چھپا ہے ان کی نظموں میں فلسفۂ انسانی کی باریکیاں اور قدرت کے نکات صاف اور ستھری زبان میں نظر آتے ہیں۔ ۲۴ نومبر ۱۹۰۸ء مطابق ۱۳۲۶ھ کو وفات پائی کلام کا انتخاب درج ذیل ہے۔

۱۳۲۔ سمندر

بڑی ہو اک عظیم الشان شے سے — پڑے جس میں کروڑوں ان طے سے
ہزاروں جس میں ہیں مخفی گنج شاہی — کروروں جس میں ہیں اسرار الٰہی
زیادہ جس کی گہرائی خرد سے — عیاں جس کی اونچائی شدومد سے
خیالوں سے بڑا پھیلاؤ جس کا — سمیٹے خوبیاں سمٹاؤ جس کا

فلک جس کے قدم لینے کو جھک جائے
زمانہ جس پہ دم لینے کو رک جائے

ستارے جس پہ شیدا ماہ مفتوں
بلا گردان ہو جس کا مہر گردوں

گھٹا چمکی ہوئی جس کی بدولت
شفق پھولی ہوئی جس کی بدولت

پہاڑوں کو جہاں روڑوں کا رتبہ
جہاں موروں سے کم گھوڑوں کا رتبہ

جہاں طوفان نوح اک موج نوخیز
جہاں خود چشم قدرت حیرت آمیز

۱۳۴ صبح پیری

کیا جانے سر کے بال تھے مدت سے کیوں سپید
نزلہ جھکا وہ ریش پہ اب یہ غضب ہوا

سیمیں یہ مو نہیں ہیں طنابیں ہیں نفیر کی
خیمہ سحر کا آن گڑا کوچ شب ہوا

اب کیجیے جا کے معرکۂ زندگی کے کام
ہوتا تھا جتنا بزم میں عیش و طرب ہوا

کیا دیکھیے آئنہ کوئی منہ ہی نہیں ہے جب
سنے کار ہی جو قبضے میں شہر حلب ہوا

آنکھوں کی دوربینوں میں بھی اب نہیں وہ زور
دانتوں کا بھی حصار ہر مت طلب ہوا

جاسوس کان کے پڑے سوتے ہیں بے خبر
ان کی بلا سے دہر میں شور و شغب ہوا

طاقت کہاں بیان میں کیجیے گا کیوں طول
مجبوریوں سے ورد زباں شکر رب ہوا

وہ دن کہاں کہ صبح سے ہو سیر جنگ کی
بازار عیش گرم جہاں وقت شب ہوا

پاؤں کے راہوار اٹھاتے نہیں قدم
کمری جو پاس سیکھا یہ ہو کیا سبب ہوا

امعا جو بگڑے پھر نہ ہوے ایک مستقیم ۔ معدے میں گرچہ ہضم مسلّم مطب ہوا
شہباز کو کہ قرض سے تھا دور جو بزرگ ۔ کیوں کر خیال نافلہ و مستحب ہوا
جب تک رہا وہ ہند میں تھا شیخِ فاسقاں ۔ کعبے گیا تو قبلۂ شیخ العرب ہوا

(۶۳) راقم ۱۹۰۹ء

خواجہ قمرالدین دہلوی بدرالدین مترجم بوستان خیال کے بیٹے تھے مرزا غالب مرحوم کے شاگرد و ریاست جے پور کے وظیفہ خوار تھے آخر عمر میں دہلی چھوڑ کر وہیں چلے گئے تھے اُن کا دیوان ۱۸۹۰ء میں افضل المطابع دہلی میں طبع ہو چکا ہے ۱۹۰۹ء کے قریب انتقال ہوا ان کی ایک کتاب تعلیم نسواں میں عقد ثریا کے نام سے یادگار ہے۔

۱۳۴ غزل

بات کیوں کر بنے اُمید بر آئے کیوں کر ۔ نالہ پر شور نہیں آہ شرر بار نہیں
آج آتے ہیں مرے شکووں کا لینے وہ جواب ۔ خیر ہے ہاتھ میں اُن کے کوئی تلوار نہیں
مجھ سے نفرت سہی لذتِ کش آزار تو ہوں ۔ غیر پھر غیر ہے وہ خوگرِ آزار نہیں

جوشِ مستی میں چلے آئے کہاں تم راقم
یہ تو مسجد ہے چلو خانۂ خمار نہیں

(۶۴) حبیب ۱۹۰۹ء

محمد کاظم۔ آپ کا سلسلہ نسب سید حمزہ ابن موسیٰ کاظم علیہ السلام تک پہونچتا ہے اور قصبہ کنتور ملک اودھ کے رہنے والے گیارہ برس کی عمر سے شعر و سخن کا شوق ہوا سب سے پہلے اپنا کلام سید لطف اللہ قدر شاگرد ناسخ کو دکھایا پھر سید حسین مرزا عاشق لکھنوی سے استفادہ سخن حاصل کیا جو ناسخ کے قابل شاگرد تھے آپ ریاست حیدرآباد میں ملازم تھے ۱۹۰۹ء میں وفات پائی کلام کا انتخاب یہ ہے۔

۱۳۵۔ غزل

حسن جب صورت گرِ ذوقِ خود آرائی ہوا
ہر بتِ بیباک گرمِ لافِ یکتائی ہوا

عشق نے سارے زمانہ کو بنایا بدگماں
خود بخود میرا تڑپنا وجہ رسوائی ہوا

اک جہاں شیدا ہے صورت آشنا کوئی نہیں
سب کو اپنا کر لیا کس کا وہ ہرجائی ہوا

کچھ بجز غفلت نہ ہاتھ آیا متاعِ دہر سے
مالِ دنیا صرفِ شغلِ بادہ پیمائی ہوا

دستِ قدرت نے دکھائیں اپنی شکلیں کھینچکر
کوئی از خود رفتہ اور کوئی تماشائی ہوا

کون ہوسکتا تھا دنیا میں کسی کا روشناس
چھپ کے ہر پردہ میں تو وجہ شناسائی ہوا

ای مسیتب دور کر دے رنج و حرمانِ حبیب
وہ بھی کوئی شعر ہے جس کا یہ تمنائی ہوا

(۶۵) جلال ۱۹۰۹ء

سید ضامن علی خلف حکیم اصغر علی لکھنوی۔ مرزا برق و رشک شاگردان ناسخ کی تلامذہ میں سے تحقیق میں اچھی دستگاہ تھی ان کی تصانیف ان کی قابلیت کی شاہد ہیں تنقیح اللغات افادۂ تاریخ۔ رسالہ عروض۔ سرمایہ زبان اُردو (لغت) اور تین دیوان اُن سے یادگار ہیں اُنھوں نے اپنی وفات پر لکھنؤ میں اپنا ہمسر کوئی نہ چھوڑا ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۹ء میں انتقال ہوا بہت سے شاگرد چھوڑے۔

۱۳۶۔ غزل

جذبِ دل کھینچ اسے دست و گریباں ہو کر

دے جگہ یار کو پہلو میں رگِ جاں ہو کر

خوش نگاہوں کے کرشمے کوئی ہم سے پوچھے
آنکھ میں کرتے ہیں گھر آنکھ سے پنہاں ہو کر

دستِ وحشت سے کہوں گا کہ اسے بھی کر چاک
دل مجھے تنگ کرے گا جو گریباں ہو کر

حسرتِ ناوکِ قاتل میں جو دل بھر آیا
آنسو آنکھوں میں کھٹکنے لگے پیکاں ہو کر

نزع میں اس لیے کھولے ہوئے بال آئے ہیں وہ
روح عاشق کی جو نکلے تو پریشاں ہو کر

ہائے اس شوخ کی شرمندگیٔ جور و ستم
مار ڈالا ہمیں ظالم نے پشیماں ہو کر

محفلِ یار سے کیونکر نہ نکالے جاتے
ہم گئے تھے ہمہ تن حسرت و ارماں ہو کر

بے وفائی میں نہ تھا یار سے کم عہدِ شباب
چل دیا صبح کو اک رات کا مہماں ہو کر

نہ رہے ہم سے سیہ بخت تو کیا غم ہے جلال
دیکھیے رہتی ہے کس کی شبِ ہجراں ہو کر

اُس سے کچھ ذکر مرا بھی دلِ ناشاد رہے — وقت پر بھول نہ جانا یہ تجھے یاد رہے

کسی بیدرد کو میں حال سنا لوں اپنا — نالہ خاموش رہے چپ ابھی فریاد رہے

یار کی ایک جفا کے مرے دل میں سو داغ — سو وفائیں مری اور اک شکلے یاد رہے

نامرادوں کی ہوئیں آج مرادیں پوری — ہم کو ناشاد لقب اُس نے دیا شاد رہے

روح جنت میں غمِ دل ہم میں نہ ہم مدفن میں — تیرے آوارہ پسِ مرگ بھی برباد رہے

اب کسی سے یہ کہینگے کہ ہمیں رنج ہی دے — شاد ہونے کی تمنا میں تو ناشاد رہے

خیر بھولے نہیں وہ تیری جفاؤں کو جلال
یہ غنیمت ہے کہ جور اپنے اُنھیں یاد رہے

(٦٦) آزاد ۱۹۱۰ء

پروفیسر مولوی محمد حسین آزاد شمس العلما۔ ان کے والد کا نام محمد باقر تھا جو شہر دہلی میں ایک مشہور شخص تھے اُنھوں نے ۱۸۳۶ء میں اُردو زبان کا سب سے پہلا اخبار دہلی سے شایع کیا تھا وہ شاعر بھی تھے اور اُستاد ذوق ہی سے تلمذ رکھتے تھے لیکن ان کا کلام مشہور نہیں ہوا نہ دیوان چھپا اُن کو اُردو نثر میں اپنے خاص رنگ کے سبب بہت کچھ شہرت حاصل ہوئی۔

شاہراہ قدیم سے ہٹ کر اُردو شاعری میں ایک جدید روش پیدا کرنے کا خیال سب سے پہلے انھیں کو آیا تھا آزاد کی طرزِ تحریر نظم و نثر دونوں کسی تعریف کی محتاج نہیں۔ بیان کی لطافت زبان کی سلاست بندش کی چستی اور محاورے کی دل آویزی سب کچھ ان کے یہاں موجود ہے ان کی کثیر تصنیفات میں دربار اکبری نیرنگ خیال۔ سخندان پارس۔ آب حیات مشہور اور مقبول ہیں۔ ان کا کچھ کلام مجموعہ نظم آزاد کے نام سے چھپ گیا ہے سنہ ۱۸۸۹ء میں ایک دماغی مرض میں مبتلا ہوگئے تھے لیکن اُس وقت بھی عالمانہ خیالات ہی دماغ میں چکر لگاتے تھے جن کی جھلک "سیاک و نمناک" میں پائی جاتی ہے جو اسی زمانۂ جنون کی تصنیف ہے سنہ ۱۹۱۰ء / ۱۳۲۸ھ میں بمقام لاہور انتقال ہوا۔ کلام کا انتخاب یہ ہے:

(۱۳۸)

خسرو امن کا دربار علم

دفعتہً دیکھا کہ اک پیرِ کہن سال آئے
پُر عجب شان سے وہ مردِ خوش اعمال آئے

جسمِ پُر نور میں پہنے ہوئے جامہ کالا
بر میں جبہ عربی سر پہ عمامہ کالا

پانوں تک شملۂ دستار جو آجاتا تھا
ان کی مقدارِ فضیلت کو بتا جاتا تھا

لاغری چہرہ پہ ہر چند کہ چھائی تھی بہت
رخ کی عینک نے مگر شان بڑھائی تھی بہت

شانہ تھا ریشِ مقدس میں کیا پیری نے
اور جھکایا تھا بڑھاپے کی زمیں گیری نے

ساتھ کچھ لوگ کتابیں تھے اُٹھائے آئے — اور بغل میں کئی جزدان دبائے آئے
سب کے سب پیچھے بصدق و صفا آتے تھے — ٹیکتے آپ کرامت کا عصا آتے تھے
الغرض بادشہ امن کے آگے آئے — پہلے سب نے بادب دستِ دعا پھیلائے
پھر یہ کی عرض کہ آتے ہیں وکالت کے لیے — علم نے بھیجا ہے تقدیمِ رسالت کے لیے
اہلِ تصنیف ہیں تصنیف میں مصروف سدا — ہے ہر اک شہرت و تعریف میں مصروف سدا
اہلِ تحصیل کو پڑھنے کے سوا کام نہیں — اور جہاں میں انہیں فکرِ سحر و شام نہیں
دم بدم علم ہی کرتا عمل ایجاد نئے — آتے ہیں کارگہِ دہر میں اُستاد نئے
درس و تدریس کے چرچے ہیں جو گھر گھر جاری — ہیں یہ جمعیتِ خاطر ہی کی باتیں ساری
جو ہمیں چاہئیں موجود ہیں سارے ساماں — ملتے ہیں پہلے ضرورت سے ہمارے ساماں
اے شہ امن یہ سب فیض و کرم تیرے ہیں — کشورِ علم میں سب بھرتے دم تیرے ہیں

تو نہ ہووے تو ابھی خلق میں طوفاں ہو جائے
سب کا شیرازۂ اوراق پریشاں ہو جائے

زمستان

۱۳۹

جاڑے کے مارے چلتے ہوئے پانی تھم گئے — اور جو تھمے ہوئے تھے وہ یخ ہو کے جم گئے
دامان کوہسار میں سورج بھی لپٹ کر — دبکا غلاف برف میں منہ کو لپیٹ کر

دیکھو جو گھر کو سب در و دیوار تھے سفید
باہر چلو تو دامن کوہسار تھے سفید
سنسان جنگل اور درختوں کی سائیں سائیں
چاروں طرف پہاڑ میں ہیں وحشی بلائیں
طوفانِ برف سر پہ کھڑا ہے تُلا ہوا
ہے یہ درہ کہ موت کا مُنہ ہے کھلا ہوا
موسم بھی معتدل ہے ہوا ہے بہک گئی
خوشبو کا ہے یہ حال کہ دنیا مہک گئی
پانی کی ہیں پہاڑ سے آوازیں آ رہیں
جو زیر بم کے دور سے ہیں سُر ملا رہیں

۱۳۹ صبح کا سماں

ناگہ فلک پہ دامنِ شب چاک ہو گیا
لبریز نور سے طبقِ خاک ہو گیا
منہ رات کا جو صبح کے آنے سے فق ہوا
گلگونہ لے کے سامنے رنگِ شفق ہوا
روئے سحر پہ شان تھی نور و ظہور کی
چاروں طرف وہ زمزمہ خوانی طیور کی
وہ گہری سبزیوں میں گلِ تر کی لالیاں
اور اوس سے بھری ہوئی پھولوں کی پیالیاں
وہ صبح کی ہوا سے درختوں کا جھومنا
اور جھوم جھوم کر وہ رخِ گل کا چومنا
سبزی جو روئے خاک پہ مخمل بچھا گئی
شبنم بھی آ کے رات کو موتی گرا گئی
پانی وہ صاف صاف جو بل کھا کے جاتے تھے
پارے کے سانپ گھاس پہ لہرا کے جاتے تھے

(۶۷) سرور ۱۹۱۰ء

منشی درگا سہائے ولد حکیم پیارے لال۔ قصبہ جہان آباد ضلع پیلی بھیت کے باشندے تھے وہیں ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے زمانۂ طالب علمی سے اساتذہ کے کلام کے مطالعہ کا شوق تھا۔ فطرت نے شاعری کا جو مادہ طبیعت میں ودیعت کیا تھا اس مطالعہ سے وہ ابھر آیا اور خود بھی شعر کہنے لگے زیادہ تر نیچرل نظمیں کہتے تھے جن کو ہندوستان کے ماہوار اردو رسالے ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔ ۱۹۱۱ء میں ان کی نظموں کا مجموعہ زمانہ پریس کانپور میں چھپا ہے ۳ دسمبر ۱۹۱۰ء کو ۳۷ سال کی عمر میں جوان فوت ہو گئے کلام کا انتخاب یہ ہے:۔

۱۴۱ دلِ بے قرار سو جا

کسی مست خواب کا ہے عبث انتظار سو جا

کہ گزر گئی شب آدھی دلِ بے قرار سو جا

یہ نسیم ٹھنڈی ٹھنڈی یہ ہوا کے سرد جھونکے

تجھے دے رہے ہیں لوری دلِ بے قرار سو جا

یہ تیری صدائے نالہ تجھے متہم نہ کر دے

مرے پردہ دار سو جا مرے رازدار سو جا

بے مجھے خوں رولا رہا ہی ترا دم بدم تڑپنا
ترے غم میں آہ کب سے ہوں میں اشکبار سوجا

ابھی دھان پان ہی تو نہیں عاشقی کے قابل
یہ تڑپنے کا آہ شیوہ نہ کر اختیار سوجا

نہ تڑپ زمیں پہ ظالم تجھے گود میں اُٹھا لوں
تجھے سینہ سے لگا لوں تجھے کرلوں پیار سوجا

تجھے جن کا ہی تصوّر ارے مستِ جامِ الفت
اُنھیں انکھڑیوں کے صدقے مرے بادہ خوار سوجا

تجھے پہلا سابقہ ہی شبِ غم بُری بلا ہی
کہیں مر مٹے نہ ظالم دلِ بے قرار سوجا

۶۰ ظہیر سالہ ۱۹۱۱ء

نواب مرزا سید ظہیر الدین حسین دہلوی خلف اکبر سید جلال الدین حیدر صلاح الدولہ مرصع رقم خان اُستاد بہادر شاہ ظفر مرحوم۔ خاقانی ہند ذوق کے نامور شاگرد تھے۔ دربار شاہی سے چودہ سال کی عمر میں "راقم الدولہ" کا خطاب مع قلمدان شاہی عطا ہوا تھا۔ دور موجودہ کے اساتذہ دہلی میں سر برآوردہ تھے۔ غزل قصیدہ

رباعی مسدس مخمس۔ مثنوی۔ غرض جملہ اصناف سخن پر قدرت رکھتے تھے غدر
کے بعد سے ریاست جے پور میں چلے گئے تھے وہاں کچھ دنوں رہے اس کے
بعد ریاست ٹونک میں ملازم ہوگئے غفران مآب ہز ہائی نس میر محبوب علی خاں
والی دکن کی قدر افزائی کا شہرہ سن کر ریاست حیدرآباد میں تشریف لائے دربار
تک رسائی نہ ہونے پائی تھی کہ علیل ہوگئے اور مارچ ۱۹۱۱ء مطابق ۱۰ ربیع الاول
۱۳۲۹ھ میں انتقال فرمایا تین دیوان شایع ہوچکے ہیں۔ کلام یہ ہے۔

غزل (۱۴۲)

گل افشانی کے دم بھرتی ہے چشم خوں فشاں کیا کیا
ہمارے زیب دامن ہے بہارِ گلستاں کیا کیا
فقط اک سادگی پر شوخیوں کے ہیں گماں کیا کیا
نگاہِ نیم گیں سے ہے نہاں کیا کیا عیاں کیا کیا
دلِ خوں گشتۂ حسرت نے کیا کیا گل کھلائے ہیں
بہار آگیں ہے کچھ اب کے برس فصلِ خزاں کیا کیا
جنوں سے کم نہیں ہے کچھ ہجوم شادمانی بھی
ہوائے گل میں ہے جامہ سے باہر باغباں کیا کیا
تصور میں وصالِ یار کے سامان ہوتے ہیں

ہمیں بھی یاد ہیں حسرت کی بزم آرائیاں کیا کیا
چلی آتی ہے اتراتی ہوئی کچھ کوئے جاناں سے
بسی ہے رشک کی بو میں نسیم بوستاں کیا کیا
قدم رکھتے نہیں ہیں وہ زمیں پر نازِ بیجا سے
بڑھا جاتا ہے یاں شوقِ سجودِ آستاں کیا کیا

ظہیرِ خستہ جاں سچ ہے محبت کچھ بُری شے ہے
مجازی میں حقیقی کے ہوئے ہیں امتحاں کیا کیا

۱۴۴

یہ رنگِ الفت اگر نہ ہوتا تو کچھ خدائی میں کم نہ ہوتا
کسی پہ کوئی نہ جان دیتا کسی پہ جور و ستم نہ ہوتا
عدو جو شایانِ ظلم ہوتے تو لطفِ درد و الم نہ ہوتا
مزے محبت کے کون لیتا جو میں قتیلِ ستم نہ ہوتا
اگر نہ کرتے وہ کج ادائی تو کچھ عداوت سے کم نہ ہوتا
جو یہ نہ ہوتی تو کیا نہ ہوتا جفا نہ ہوتی ستم نہ ہوتا
غلط ہے شکوہ کہ وہ نہ آئے مجھے تو ہر طرح موت آتی
اگر وہ آتے تو جی نہ جاتا کہ فرطِ شادی سے دم نہ ہوتا

یہ کیسے اپنا ہی جی نہ چاہا وگرنہ خوفِ رقیب کیا تھا
کہ آپ آتے تو اُڑکے آتے زمیں پہ نقشِ قدم نہ ہوتا

عضب ہی شورش تپش قیامت سوا ہی دوزخ سے سوزِ الفت
وگرنہ جانِ حزیں پہ اتنا کبھی عذابِ الم نہ ہوتا

اگر عدو پر عذاب ہوتا نہ دل میں یوں پیچ و تاب ہوتا
جبیں پہ ہردم شکن نہ پڑتی شکن سے ابرو میں خم نہ ہوتا

ظہیر ملتی نہ راہ ایماں جو کفر کرتا نہ رہنمائی
لبوں پہ یادِ خدا نہ ہوتی جو وردِ ہجرِ صنم نہ ہوتا

۶۹ آصف سادس ۱۹۱۱ء

ہزہائی نس نواب میر محبوب علی خاں بہادر نظام الملک آصف جاہ سادس
آپ ۱۸ اگست ۱۸۶۶ء کو پیدا ہوئے اور ۲۶ فروری ۱۸۶۹ء میں کچھ کم تین برس کی عمر میں باقاعدہ تخت نشین ہوئے۔ انگریزی، عربی۔ فارسی سے بخوبی واقف تھے اور لڑکپن سے علمی مذاق میں فرد و یگانہ تھے۔ شکار کا نہایت شوق تھا شعر و سخن سے آپ کی طبیعت کو خاص مناسبت تھی حضرت داغ دہلوی مرحوم اس فن میں مشورہ دیتے تھے شعر میں سلاست زبان و مضمون آفرینی کا لحاظ

رکھتے تھے۔ تاریخ وفات ۲۹ر اگست ۱۹۱۱ء ہی دیوان غیر مطبوعہ ہی۔ کلام بہ ہی۔

غزل - ۱۴۴

یہ دل آشنا اور نا آشنا ہی
بھلوں سے بھلا اور بروں سے برا ہی

نہیں ہو اگر تو ہمارا تو کیا ہی
زمانہ میں کوئی کسی کا ہوا ہی

پیو بھی پلاؤ بھی اس کا مزا ہی
یہ شیشہ بھرا ہی یہ ساغر دھرا ہی

مزہ ہی یہی بات میں بات سے نکلے
ادا سے ادا جب نہ ہو پھر تو کیا ہی

نشانہ بنے دیکھیے کونسا دل
یہ تیر دعا ہی وہ تیر ادا ہی

کریں بت کدہ سے عبث قصد کعبہ
یہاں بھی خدا ہی وہاں بھی خدا ہی

کہاں جائے انسان ان سے نکل کر
زمیں فتنہ گر ہی فلک فتنہ زا ہی

شب وصل کس طرح طی ہو یہ جھگڑا
نہ تم مانتے ہو نہ دل مانتا ہی

کہو پھر تو گھرا کے ذکر عدو پہ
نہیں ہم تو واقف خدا جانتا ہی

یہ کافر حسین اک جگہ جمع ہوں گے
جہنم میں بھی اک طرح کا مزا ہی

بہت دور ہی منزل دوست اے دل
جو یہ طی ہوئی پھر خدا ہی خدا ہی

کوئی بے وفاؤں کے دم میں نہ آئے
محبت جو کی تھی یہ اس کی سزا ہی

ہمارے بھی ہی امتحاں میں یہ آصف

لگانا ہی دل کا سراسر خطا ہے

۱۰۔ تسلیم ۱۹۱۱ء

شیخ امیر اللہ خلف مولوی عبد الصمد صاحب فیض آبادی۔ شاگرد رشید میرزا اصغر علی خاں نسیم دہلوی آپ ۱۸۲۰ء میں جبکہ غازی الدین حیدر مسند نشین ہوئے تھے پیدا ہوئے عرصۂ دراز تک لکھنؤ میں رہے وہاں کے مشاعروں میں شرکت کی اہل سخن سے صحبت گرم رہی اس کے بعد نواب کلب علی خاں بہادر کے عہد میں رامپور تشریف لائے اور مشاہیر شعرا میں اپنی بلند خیالی اور سخن سرائی کی داد پائی آپ کے دو دیوان اور مثنویات نالۂ تسلیم۔ دل و جان۔ صبح خنداں طبع ہو چکی ہیں دور موجودہ کے شعرا میں نامور تھے ۱۹۱۱ء م ۱۳۲۹ھ میں انتقال کیا۔

۱۴۵۔ غزل

قیامت کی ہے بے تابی سرشک چشم گریاں میں
کبھی پہلوے مژگاں میں کبھی آغوشِ داماں میں
دمِ طفلی سے میں ہوں آشنائے مرگ دوراں ہیں
فلک نے مجھکو پالا دامنِ شمشیرِ عریاں میں
بنی ہے یہ مرے دم پہ کہ میں پچھلے پہر آخر

اجل کو ڈھونڈھنے نکلا شبِ تاریک ہجراں ہیں
نظر کر ای ستمگر ربط باہم اس کو کہتے ہیں
کہ پیکاں دل میں ہی دل نازبرداریِ پیکاں ہیں
ہوا میں زندۂ جاوید ہو کر قتل ای قاتل
بجھی تھی کیا تری شمشیر موجِ آبِ حیواں ہیں
جھکا دو شرم سے عالم دکھا کر قدِ موزوں کا
اُٹھایا ہی بہت سروِ سہی نے سر گلستاں ہیں
چلو گھر خاک بھی ڈالو حنا کا خون ہوتا ہی
کفِ افسوس ملتے ہو کھڑے گنجِ شہیداں ہیں
حسینوں سے بگڑنا اور دل کو داغ دیتا ہی
بہت روئی زلیخا بھیجکر یوسف کو زنداں ہیں

ڈراتا کیوں ہی ای تسلیم واعظ مجھکو دوزخ سے
مرا حصہ نہیں ہی کیا خدا کے فضل و احساں ہیں

(۷۱) بیخود ۱۲ سلہ ۱۹ع

بیخود - مولوی عبد الحی ـ تخلص بیخود ـ خلف مولوی غلام سرور صدیقی - بدایونی

۱۲۷۸ھ مطابق ۸ ستمبر ۱۸۶۱ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ فارسی عربی سے بخوبی ماہر تھے۔ دونوں زبانوں میں عمدہ استعداد رکھتے تھے۔ خوش رو، خوش لباس، زندہ دل، رنگیں مزاج شاعر تھے۔ اساتذہ گزشتہ کے ذوقِ سخن سے آشنا ہو کر خود بھی معنی آفرینی کی طرف توجہ کرنے لگے۔ سب سے پہلے حضرت حالی مرحوم کے شاگرد ہوئے۔ آخر میں جناب داغ دہلوی کے ممتاز تلامذہ میں شامل ہوئے۔ ان کا کلام صفائی بیان اور جذبات سے مالامال ہے۔ پہلے شاہجہانپور میں وکالت کی۔ آخر عمر میں ریاست جودھپور میں مجسٹریٹ تھے۔ نومبر ۱۹۱۲ء میں انتقال ہوا۔ کلام یہ ہے:-

۱۴۶۔ غزل

دردِ دل میں کمی نہ ہو جائے
دوستی دشمنی نہ ہو جائے

کہتے ہو کوئی ہم کو دل کیوں دے
کہیں سچ مچ یہی نہ ہو جائے

تم مری دوستی کا دم نہ بھرو
آسماں مدعی نہ ہو جائے

کج ادائی تری ادا ٹھہری
میری نیکی بدی نہ ہو جائے

بیٹھتا ہے ہمیشہ رندوں میں
کہیں زاہد ولی نہ ہو جائے

طالع بد وہاں بھی ساتھ نہ دے
موت بھی زندگی نہ ہو جائے

حشر پر دید کیوں اٹھا رکھی
ہونے والی ابھی نہ ہو جائے

بھول جائیں نہ وہ جفا اپنی
یہ ہوئی ان ہوئی نہ ہو جائے

اپنی خوئے وفا سے ڈرتا ہوں — عاشقی بندگی نہ ہو جائے

کہیں بیخود تمھاری خودداری
مانع بے خودی نہ ہو جائے

۱۴۷۔ قطعہ

ازل میں داد و دہش کا جو حکم عام ہوا — تو سب کو مال مزوری علی الحساب ملا
کسی کو عالم طفلی کا عیش اور آرام — کسی کو راحت و عشرت بہ عہد شباب ملا
کسی نے دولت ارمان و آرزو پائی — کسی کو خلعت اندوہ و اضطراب ملا
کسی کے بانٹ میں قسمت سے شوخیاں آئیں — کسی کو شرم عنایت ہوئی، حجاب ملا
کسی کی جان کو تکلیف انتظار ملی — کسی کے دل کو غم ہجر کا عذاب ملا
کسی کو پردہ نشینوں کا غم نصیب ہوا — کسی کو عشق رخ یار بے نقاب ملا
جو عاصیوں کے اجارے میں معصیت آئی — تو زاہدوں کو طریق رہ صواب ملا
کسی کی بات نے اعجاز عیسوی پایا — کسی کے قلب کو آزار التہاب ملا
کسی کو ذوق کباب جگر حصول ہوا — کسی کو شوق قدح نوشی شراب ملا
کسی نے عشوہ گر و کج نظر لقب پایا — کسی کو بے خود شوریدہ سر خطاب ملا
کسی کے بخت نے پائی سپہر کی گردش — کسی کے دل کو زمانے کا انقلاب ملا

کسی کو عقل۔ کسی کو تمیز ہاتھ آئی
ملا زمیں کو شرف جلوۂ حسیناں سے
غرض کہ۔ میں نے کیا جس قدر خیال اُس دن
مگر نصیب سے بیخودؔ ہی رہ گیا محروم

کسی کو ذہن ہزاروں میں انتخاب ملا
فلک کو بہر ضیا نورِ آفتاب ملا
ہر ایک اپنی مرادوں پہ کامیاب ملا
نہ کچھ عذاب ہی پایا نہ کچھ ثواب ملا

پھر اب کہو کہ "دیا کیا" کسی نے۔ کچھ نہ دیا
پھر اب کہو کہ "ملا کیا" فقط جواب ملا

(۷۲) احسان ۱۹۱۴ء

احسان منشی احسان علی خاں خلف منشی قاسم علی خاں۔ آپ شاہجہان پور کے باشندے تھے۔ ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۸۵۵ء میں ولادت ہوئی۔ حکیم سید ضامن علی جلال لکھنوی کے شاگردان رشید سے تھے۔ شاہ جہانپور میں مختاری کا پیشہ کرتے تھے۔ وہیں ایک اُردو ماہوار رسالہ "ارمغان" کے نام سے جاری کیا تھا جو کچھ دنوں چل کر بند ہو گیا۔ جولائی ۱۹۱۴ء میں وفات پائی۔ دیوان اور رسالہ شبیہ ہار آپ کی یادگار ہیں۔ کلام یہ ہے:۔

۱۴۸۔ غزل

اس کو نہ سوچیے کہ ستم یا کرم ہوا
خنجر اُٹھائیے سرِ تسلیم خم ہوا

ٹوٹا ہمارے دل کو بتوں نے ستم ہوا	وہ بھی انھیں کا قول انھیں کی قسم ہوا
اپنی گلی میں دیکھ کے ہم ہو رہے ہیں خوش	نقش امید یار کا نقش قدم ہوا
کیسا ہی وفا نے پشیمان کر دیا	آنکھیں بھی ان کی جھک گئیں غصہ بھی کم ہوا
دونوں طرف ہی جیت ہی دل ایک جان ایک	مجھ پہ ستم ہوا تو تمھیں پر ستم ہوا
محروم عیش میری طرح دوسرا کہاں	دل میں سرور وصل بھی آیا تو غم ہوا

احسان ضبط کرنے سے اخفائے راز عشق
دل سے بہت ہوا مگر آنکھوں سے کم ہوا

(۳۷) حالی ۱۹۱۴ء

حالی۔ شمس العلماء خواجہ الطاف حسین خلف خواجہ ایزد بخش انصاری۔ مولد پانی پت ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ جوانی میں دہلی آ گئے تھے۔ ابتداءً حضرت شیفتہ سے کلام میں اصلاح لیتے تھے۔ بعدہٗ اردو فارسی دونوں کلام مرزا غالب کو دکھانے لگے اور آپ کے ارشد تلامذہ میں داخل ہوئے۔ چالیس پینتالیس سال کی عمر تک قدیم طرز میں غزل کہتے رہے۔ ۱۸۷۹ء میں جب کہ سر سید احمد خاں مرحوم مسلمانوں کو بیدار کرنے کے لیے ایک نئی روح پھونک رہے تھے اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ قائم ہوئے صرف چار سال گزرے تھے۔ حالی پر سر سید کی نظر پڑی اور وہ یہ کہہ اٹھے

آں دل کہ رم نمودے از خوبرو جواناں
دیرینہ سال پیرے بردش بیک نگاہے

اُسی زمانہ میں اُنھوں نے سر سید کی تحریک سے مُسدّس "مدّ و جزرِ اسلام" لکھا جس میں مسلمانوں کو اُن کی گزشتہ اور موجودہ حالت کا نقشہ اس طرح دکھایا کہ سخت سے سخت دل میں تاثیر کی ایک بجلی دوڑ گئی۔ اس مسدس کے شایع ہونے سے نہ صرف مسلمانوں میں ترقی کے جذبات پیدا ہوئے بلکہ اُردو نظم کی تاریخ میں قومی شاعری کی داغ بیل پڑ گئی۔ اس سے قبل اس قسم کی نظم اُردو میں موجود نہ تھی۔ اور نہ اس وقت تک اس پایہ کی کوئی دل گداز قومی نظم اُردو میں پائی جاتی ہے یہ وہی مسدس ہے جس کی نسبت سر سید نے مولانا حالی کو اپنے خط مورخہ ۱۰؍ جون ۱۸۹۴ء میں لکھا تھا" بیشک میں اس کا محرک ہوا اور اس کو میں اپنے اعمال حسنہ میں سے سمجھتا ہوں جب خدا پوچھے گا کہ "تو کیا لایا" میں کہونگا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں"۔ یہ مسدس مختلف مطابع میں لاکھوں کی تعداد میں چھپ چکا ہے۔ ایک نفیس پاکٹ اڈیشن ۱۹۰۹ء میں نامی پریس کانپور نے چھاپا تھا۔ اس سے قبل اسی مطبع نے ایسا ہی اڈیشن رباعیات حالی کا بھی شایع کیا تھا جس کی ملک نے بہت قدر کی مولانا حالی کا درجہ نثر نگاری میں بھی کم نہ تھا۔ حیات جاوید۔ یادگارِ غالب وغیرہ اس کی شاہد ہیں۔ دیوان حالی مع ایک مبسوط مقدمہ کے ۱۸۹۳ء میں نامی پریس میں طبع ہوا ہے۔ ۳۰؍ دسمبر ۱۹۱۴ء مطابق ۱۳۳۳ھ کو خواجہ صاحب کا انتقال ہو گیا

انتخاب مدّ و جزرِ اسلام

١٤٩ بعثت ختم المرسلین

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا

مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

فقیروں کا ملجا۔ ضعیفوں کا ماوےٰ
یتیموں کا والی۔ غلاموں کا مولےٰ

خطا کار سے درگزر کرنے والا
بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا

مفاسد کو زیر و زبر کرنے والا
قبائل کو شیر و شکر کرنے والا

اُتر کر حرا سے سوے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

مسِ خام کو جس نے کندن بنایا
کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا

عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا
پلٹ دی بس اک آن میں اُس کی کایا

رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
اِدھر سے اُدھر پھر گیا رُخ ہوا کا

پڑی کان میں دھات تھی اک نکمّی
نہ کچھ قدر تھی اور نہ قیمت تھی جس کی

طبیعت میں جو اس کی جوہر تھے اصلی
ہوے سب تھے مٹّی میں مل کر وہ مٹّی

پہ تھا ثبت علمِ قضا و قدر میں

کہ بن جائے گی وہ طلا اک نظر میں

وہ فخرِ عرب زیبِ محراب و منبر
گیا ایک دن حسبِ فرمانِ داور
تمام اہلِ کعبہ کو ہمراہ لیکر
سوئے دشت اور چڑھ کے کوہِ صفا پر

یہ فرمایا سب سے کہ اے آلِ غالب
سمجھتے ہو تم مجھکو صادق کہ کاذب

کہا سب نے "قول آج تک کوئی تیرا
کبھی ہم نے جھوٹا سنا اور نہ دیکھا"
کہا گر سمجھتے ہو تم مجھکو ایسا
تو باور کروگے اگر میں کہونگا

کہ فوجِ گراں پشتِ کوہِ صفا پر
پڑی ہے کہ لوٹے تمہیں گھات پاکر

کہا "تیری ہر بات کا یاں یقیں ہے
کہ بچپن سے صادق ہے تو اور امیں ہے"
کہا "گر مری بات یہ دل نشیں ہے
تو سن لو خلاف اس میں اصلا نہیں ہے

کہ سب قافلہ یاں سے ہے جانے والا
ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا"

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی
نئی اک لگن سب کے دل میں لگا دی
اک آواز میں سوتی بستی جگا دی

پڑا ہر طرف غل یہ پیغامِ حق سے
کہ گونج اٹھے دشت و جبل نامِ حق سے

۱۵۰۔ خلافت اندلس

کوئی قرطبہ کے کھنڈر جا کے دیکھے
مساجد کے محراب و در جا کے دیکھے
حجازی امیروں کے گھر جا کے دیکھے
خلافت کو زیر و زبر جا کے دیکھے

جلال اُن کا کھنڈروں میں ہے یوں چمکتا
کہ ہو خاک میں جیسے کندن دمکتا

(۱۵۱) خلافت بغداد

وہ بلدہ کہ فخر بلادِ جہاں تھا
تر و خشک پر جس کا سکہ رواں تھا
گڑا جس میں عباسیوں کا نشاں تھا
عراق عرب جس سے رشکِ جناں تھا

اُڑا لے گئی بادِ پندار جس کو
بہا لے گئی سیل تاتار جس کو

سُنے گوشِ عبرت سے جا کے گر انساں
تو واں ذرہ ذرہ یہ کرتا ہے اعلاں
کہ تھا جن دنوں مہرِ اسلام تاباں
ہوا یاں کی تھی زندگی بخشِ دوراں

پڑی خاکِ ایتھنز میں جان یہیں سے
ہوا زندہ پھر نامِ یوناں یہیں سے

وہ لقمان و سقراط کے دُرِ مکنوں — وہ اسرارِ بقراط و درسِ فلاطوں
ارسطو کی تعلیم، سولن کے قانوں — پڑے تھے کسی قبر کہنہ میں مدفوں

یہیں آکے مُہرِ سکوت اُن کی ٹوٹی
اِسی باغِ رعنا سے بو اُن کی چھوٹی

وہ تارے جو تھے شرق میں لمعہ افگن — پہ تھا اُن کی کرنوں سے تا غرب روشن
نوشتوں سے ہیں جن کے اب تک مزیّن — کتب خانۂ پیرس و روم و لندن

پڑا غلغلہ جن کا تھا کشوروں میں
وہ سوتے ہیں بغداد کے مقبروں میں

(۱۵۲)

ملت اسلامیہ اور دیگر اقوام و ملل

ملے کوئی ٹیلا اگر ایسا اونچا — کہ آتی ہو واں سے نظر ساری دنیا
چڑھے اُس پہ پھر اک خردمند دانا — کہ قدرت کے دنگل کا دیکھے تماشا

تو قوموں میں فرق اس قدر پائے گا وہ
کہ عالم کو زیر و زبر پائے گا وہ

وہ دیکھے گا ہر سو ہزاروں چمن ہاں — بہت تازہ تر صورتِ باغِ رضواں
بہت اُن سے کمتر، پہ سرسبز خنداں — بہت خشک اور بے طراوت اگہاں

نہیں لائے گو برگ و بار اُن کے پودے
نظر آتے ہیں ہونہار اُن کے پودے

پھر اک باغ دیکھے گا اجڑا سراسر
جہاں خاک اُڑتی ہے ہر سو برابر

نہیں تازگی کا کہیں نام جس پر
ہری ٹہنیاں جھڑ گئیں جس کی جل کر

نہیں پھول پھل جس میں آنے کے قابل
ہوئے روکھ جس کے جلانے کے قابل

جہاں زہر کا کام کرتا تھا باراں
جہاں آکے دیتا ہے رو ابر نیساں

ترودّ سے جو اور ہوتا ہے ویراں
نہیں رہن جس کو خزاں اور بہاراں

یہ آواز پیہم وہاں آ رہی ہے
کہ اسلام کا باغ ویراں یہی ہے

وہ دینِ حجازی کا بیباک بیڑا
نشاں جس کا اقصائے عالم میں پہنچا

مزاحم ہوا کوئی خطرہ نہ جس کا
نہ عمّاں میں ٹھٹکا نہ قلزم میں جھجکا

کیے پے سپر جس نے ساتوں سمندر
وہ ڈوبا دہانے میں گنگا کے آکر

(۱۵۳) اُمید سے خطاب

بس اے نا اُمیدی نہ یوں دل بجھا تو
جھلک اے اُمید اپنی آخر دکھا تو

ذرا نااُمیدوں کی ڈھارس بندھا تو — فسردہ دلوں کے دل آخر بڑھا تو

ترے دم سے مُردوں میں جانیں پڑی ہیں
جلی کھیتیاں تو نے سرسبز کی ہیں

سفینۂ نوحؑ طوفاں میں تو تھی — سکوں بخشِ یعقوبؑ کنعاں میں تو تھی
زلیخا کی غم خوار ہجراں میں تو تھی — دل آرام یوسفؑ کی زنداں میں تو تھی

مصائب نے جب آن کر اُن کو گھیرا
سہارا وہاں سب کو تھا ایک تیرا

بہت ڈوبتوں کو ترایا ہے تو نے — بگڑتوں کو اکثر بنایا ہے تو نے
اُکھڑتے دلوں کو جمایا ہے تو نے — اُجڑتے گھروں کو بسایا ہے تو نے

بہت تو نے پستوں کو بالا کیا ہے
اندھیرے میں اکثر اُجالا کیا ہے

تو ہی تجھ سے ہمت ہے پیر و جواں کی — بندھی تجھ سے ڈھارس ہے خورد و کلاں کی
تجھی پر ہے بنیاد نظمِ جہاں کی — نہ ہو تو۔ تو رونق نہ ہو اس دُکاں کی

تگاپو ہے ہر مرحلے میں تجھی سے
رواں رو ہے ہر قافلے میں تجھی سے

کسانوں سے کلّہ میں ہے تو بُواتی — جہازوں کو گرداب میں ہے کھواتی
سکندر کو دارا پہ ہے تو چڑھاتی — فریدوں کو ضحّاک سے ہے لڑاتی

چلے سب جدھر تو نے مائل عناں کی
نظر تیری سیٹی پہ ہے کارواں کی

نوازا بہت سے نواؤں کو تو نے
تونگر بنایا گداؤں کو تو نے
دیا دست رس نارساؤں کو تو نے
کیا بادشہ ناخداؤں کو تو نے

سکندر کو شانِ کئی تو نے بخشی
کلمبس کو دنیا نئی تو نے بخشی

وہ رہرو نہیں رکھتے جو کوئی ساماں
خور و زاد سے جن کا خالی ہے داماں
نہ ساتھی کوئی جس سے منزل ہو آساں
نہ محرم کوئی جو سنے دردِ پنہاں

ترے بل پہ خوش خوش ہیں اس طرح جاتے
کہ جا کر خزانے ہیں اب کوئی پاتے

زمیں جوتنے کو جب اٹھتا ہے جوتا
سبھوں کا گماں تک نہیں جبکہ ہوتا
شب و روز محنت میں ہے جان کھوتا
بچھونوں نہیں پا تو پچھلا کے سوتا

اگر موجزن اس کے دل میں نہ تو ہو
تو دنیا میں غل بھوک کا چار سو ہو

بنے اس سے بھی گر سوا اپنے دم پر
بلاؤں کا ہو سامنا ہر قدم پر
پہاڑ اک فزوں اور ہو کوہِ غم پر
گزرنی ہو جو کچھ گزر جائے ہم پر

نہیں فکر تو دل بڑھاتی ہے جب تک

دماغوں میں بو تیری آتی ہے جب تک

یہ سچ ہے کہ حالت ہماری زبوں ہے
عزیزوں کی غفلت ہی جوں کی توں ہے
جہالت وہی قوم کی رہنموں ہے
تعصب کی گردن پہ ملت کا خوں ہے

مگر اے امید اک سہارا ہے تیرا
کہ جلوہ یہ دنیا میں سارا ہے تیرا

۱۵۴ - قطعہ

ہوئی ریعانِ جوانی کی بہا آخر حیف
طبع رنگیں تھی مے عشق کی جب متوالی
اپنی روداد تھی۔ جو عشق کا کرتے تھے بیاں
جو غزل لکھتے تھے ہوتی تھی سراسر حالی
اب کہ الفت ہے، نہ چاہت، نہ جوانی نہ اُمنگ
سر ہے سودا سے تہی، عشق سے دل ہے خالی
آپ بیتی نہ ہو جو۔ ہے وہ کہانی بے لطف
گرچہ ہوں لفظ فصیح اور زباں ٹکسالی
ہاں مگر کیجیے کچھ عشق کا غیروں کے بیاں
لائیے باغ سے اوروں کے لگا کر ڈالی
کھینچیے وصل صنم کی کبھی فرضی تصویر
کیجیے دردِ جدائی کی کبھی نقالی
تا کہ ٹھڑکاسے جوانوں کے دل۔ آتش کی طرح
وہ ہوا جس سے دماغ اپنا ہوا ہے خالی

پر یہ ڈر ہے کہ کہیں ہو۔ نہ ہماری وہ مَثَل
قحبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلّالی“

(۱۵۵)

جیتے جی موت کے تم منہ میں نہ جانا ہرگز
دوستو! دل نہ لگانا۔ نہ لگانا۔ ہرگز

عشق بھی تاک میں بیٹھا ہے نظربازوں کی
دیکھنا! شیر سے آنکھیں نہ لڑانا ہرگز

زال کی پہلے ہی رستم کو نصیحت یہ تھی
زد میں تیرِ صفِ مژگاں کی نہ جانا ہرگز

چاہت اک ظلمتِ مکروہ ہے برقع میں نہاں
کسی لالہ کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز

ہاتھ ملنے نہ ہوں پیری میں اگر حسرت سے
تو جوانی میں نہ یہ روگ بسانا ہرگز

جتنے رہتے تھے ترے ہو گئے ویراں اے عشق
آکے ویرانوں میں اب گھر نہ بسانا ہرگز

کوچ سب کر گئے دلّی سے ترے قدرشناس
قدر یاں رہ کے اب اپنی نہ گنوانا ہرگز

تذکرہ دہلیِ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانا ہرگز

داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رُلانا ہرگز

ڈھونڈتا ہے دلِ شوریدہ بہانے مطرب
دردانگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز

صحبتیں اگلی مصوّر! ہمیں یاد آئیں گی
کوئی دلچسپ مرقّع نہ دکھانا ہرگز

موجزن دل میں ہیں یاں خون کے دریا اے چشم
دیکھنا! ابر سے آنکھیں نہ چرانا ہرگز

لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیّاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہرِ یکتا تہِ خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانا ہرگز

مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو
اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

وہ تو بھولے تھے ہمیں ہم بھی انھیں بھول گئے
ایسا بدلا ہے نہ بدلے گا زمانہ ہرگز

جس کو زخموں سے حوادث کے اچھوتا سمجھیں
نظر آتا نہیں۔ اک ایسا گھرانا ہرگز

ہم کو گر تو نے رُلایا تو رُلایا اے چرخ
ہم پہ غیروں کو تو ظالم نہ ہنسانا ہرگز

یار خود روئیں گے کیا۔ اُن پہ جہاں تا ہے
ان کی ہنستی ہوئی شکلوں پہ نہ جانا ہرگز

آخری دور میں بھی تجھکو قسم ہے ساقی
بھر کے اک جام نہ پیاسوں کو پلانا ہرگز

بخت سوئے ہیں بہت جاگ کے اے دورِ زماں
نہ ابھی نیند کے ماتوں کو جگانا ہرگز

یاں سے رخصت ہو سویرے کہیں اے عیش و نشاط
نہیں اس دور میں یاں تیرا ٹھکانا ہرگز

کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمھارا دہلی
ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز

شاعری مر چکی اب زندہ نہ ہوگی یارو
یاد کر کر کے اُسے جی نہ کڑھانا ہرگز

غالبؔ و شیفتہؔ و نیّرؔ و آزردہؔ و ذوقؔ
اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانا ہرگز

مومنؔ و علویؔ و صہبائیؔ و ممنونؔ کے بعد
شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز

کر دیا مر کے یگانوں نے یگانہ ہم کو
ورنہ یاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانہ ہرگز

داغؔ و مجروحؔ کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانا ہرگز

رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر
اب نہ دیکھو گے کبھی لطفِ شبانہ ہرگز

بزمِ ماتم تو نہیں۔ بزمِ سخن ہے حالیؔ
یاں مناسب نہیں رو رو کے رُلانا ہرگز

۱۵۶- قصیدہ عرض حال بجناب سرور کائنات صلعم

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے
اُمّت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

جس دین کے مدعو تھے کبھی سیزر و کسریٰ
خود آج وہ مہمانِ سرائے فقرا ہے

وہ دین ہوئی بزمِ جہاں جس سے چراغاں
اب اس کی مجالس میں نہ بتّی نہ دیا ہے

جو دین کہ تھا شرک سے عالم کا نگہباں
اب اس کا نگہبان اگر ہے تو خدا ہے

جو تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے
اس دین میں خود تفرقہ اب آ کے پڑا ہے

جس دین نے تھے غیروں کے دل آ کے ملائے
اس دین میں خود بھائی سے اب بھائی جدا ہے

جو دین کہ ہمدردِ بنی نوعِ بشر تھا
اب جنگ و جدل چار طرف اس میں بپا ہے

جس دین کا تھا فقر بھی اکسیرِ غنا بھی
اُس دین میں اب فقر ہے باقی نہ غنا ہے

جو دین کہ گودوں میں پلا تھا حکما کے
وہ عرضۂ تیغِ جُہلا و سُفہا ہے

جس دین کی حجت سے سب ادیان تھے مغلوب
اب معترض اس دین پہ ہر ہرزہ درا ہے

ہے دین ترا اب بھی وہی چشمۂ صافی
دیندار وں میں پر آب ہے باقی نہ صفا ہے

عالم ہے سو بے عقل ہے جاہل ہے سو وحشی
منعم ہے سو مغرور ہے مفلس سو گدا ہے

یاں راگ ہے دن رات تو واں رنگ شب و روز
یہ مجلسِ اعیان ہے وہ بزمِ شرفا ہے

چھوٹوں میں اطاعت ہے نہ شفقت ہے بڑوں میں
پیاروں میں محبت ہے نہ یاروں میں وفا ہے

دولت ہے نہ عزت نہ فضیلت نہ ہنر ہے
اک دین ہے باقی سو وہ بے برگ و نوا ہے

ہے دین کی دولت سے بہا علم سے رونق
بے دولت و علم اس میں رونق نہ بہا ہے

شاہد ہے اگر دین تو علم اس کا ہے زیور
زیور ہے اگر علم تو مال اس کی جلا ہے

جس قوم میں اور دین ہو علم نہ دولت
اس قوم کی اور دین کی پانی پہ بنا ہے

گو قوم میں تیری نہیں اب کوئی بڑائی
پر نام تری قوم کا یاں اب بھی بڑا ہے

ڈر ہے کہیں یہ نام بھی مٹ جائے نہ آخر
مدت سے اسے دورِ زماں میٹ رہا ہے

جس قصر کا تھا سر بہ فلک گنبدِ اقبال
ادبار کی اب گونج رہی اس میں صدا ہے

بیڑا تھا نہ جو بادِ مخالف سے خبردار
جو چلتی ہے اب چلتی خلاف اس کے ہوا ہے

وہ روشنیٔ بام و درِ کشورِ اسلام
یاد آج تلک جس کی زمانے کو ضیا ہے

روشن نظر آتا نہیں واں کوئی چراغ آج
بجھنے کو ہے اب گر کوئی بجھنے سے بچا ہے

عشرت کدے آباد تھے جس قوم کے ہر سو
اُس قوم کا اک ایک گھر اب بزمِ عزا ہے

چاؤش تھے للکارتے جن رہ گزروں میں
دن رات بلند اُن میں فقیروں کی صدا ہے

وہ قوم کہ آفاق میں جو سر بہ فلک تھی
وہ یاد میں اسلاف کے اب رو بہ قفا ہے

جو قوم کہ مالک تھی علوم اور حکم کی
اب علم کا واں نام نہ حکمت کا پتا ہے

کھوج ان کے کمالات کا لگتا ہے اب اتنا
گم دشت میں اک قافلہ بے طبل و درا ہے

بگڑی ہے کچھ ایسی کہ بنائے نہیں بنتی
ہے اس سے یہ ظاہر کہ یہی حکمِ قضا ہے

تھی آس تو تھا خوف بھی ہمراہ رجا کے
اب خوف ہے مدت سے دلوں میں نہ رجا ہے

جو کچھ ہیں وہ سب اپنے ہی ہاتھوں کے ہیں کرتوت
شکوہ ہی زمانے کا نہ قسمت کا گلا ہی
دیکھے ہیں یہ دن اپنی ہی غفلت کی بدولت
سچ ہی کہ بُرے کام کا انجام بُرا ہی

کی زیب بدن سب نے ہی پوشاک کتاں کی
اور برف میں ڈوبی ہوئی کشتی کی ہوا ہی
درکار رہی یاں معرکے میں جوشن و خفتاں
اور دوش پہ یاروں کے وہی خرقہ ردا ہی

دریاے پُر آشوب ہی اک راہ میں حائل
اور بیٹھ کے گھوڑنا و پہ یاں قصدِ شنا ہی
ملتی نہیں اک بوند بھی پانی کی جہاں مفت
واں قافلہ سب گھر سے تہی دست چلا ہی

یہاں نکلے ہیں سودے کو درم لیکے پرائے
اور سکّہ رواں شہر میں مدت سے نیا ہی
فریاد ہی ای کشتیٔ اُمت کے نگہباں
بیڑا یہ تباہی کے قریب آن لگا ہی

ای چشمۂ رحمت بابی انت و اُمّی
دنیا پہ ترا لطف سدا عام رہا ہی
جس قوم نے گھر اور وطن تجھ سے چھڑایا
جب تو نے کیا نیک سلوک اُن سے کیا ہی

صدمہ دُرِ دنداں کو ترے جن سے کہ پہنچا
کی اُن کے لیے تو نے بھلائی کی دعا ہی
کی تو نے خطا عفو ہی ان کینہ کشوں کی
کھانے میں جنھوں نے کہ تجھے زہر دیا ہی

سو بار ترا دیکھ کے عفو اور ترحم
ہر باغی و سرکش کا سر آخر کو جھکا ہی
جو بے ادبی کرتے تھے اشعار میں تیری
منقول انھیں سے تری پھر مدح و ثنا ہی

برتاؤ ترے جبکہ یہ اعدا سے ہیں اپنے
اعدا سے غلاموں کو کچھ اُمید سوا ہی
کر حق سے دعا اُمت مرحوم کے حق میں
خطروں میں بہت جس کا جہاز آ کے گھرا ہی

اُمت میں تری نیک بھی ہیں بد بھی ہیں لیکن
دل دادہ ترا ایک سے ایک ان میں سوا ہی

ایمان جسے کہتے ہیں عقیدہ میں ہمارے
وہ تیری محبّت تری عترت کی وِلا ہی

ہر چپقلشِ دہرِ مخالف میں ترا نام
ہتھیار جوانوں کا ہی پیروں کا عصا ہی

جو خاک ترے در پہ ہی جاروب سے اُڑتی
وہ خاک ہمارے لیے دارو کے شفا ہی

جو شہر ہوا تیری ولادت سے مشرف
اب تک وہی قبلہ تری اُمّت کا رہا ہی

جس ملک نے پائی تری ہجرت سے سعادت
کعبہ سے کشش اس کی ہر اک دل میں سوا ہی

کل دیکھیے پیش آے غلاموں کو ترے کیا
اب تک تو ترے نام پہ اک ایک فدا ہی

گر بد ہیں تو حق اپنا ہی کچھ تجھ پہ زیادہ
اخباروں میں اطلبوا لی ہم نے سُنا ہی

ہم نیک ہیں یا بد ہیں پھر آخر ہیں تمھارے
نسبت بہت اچھی ہی اگر حال بُرا ہی

تدبیر سنبھلنے کی ہمارے نہیں کوئی
ہاں ایک دعا تیری کہ مقبولِ خدا ہی

خود جاہ کے طالب ہیں نہ عزّت کے ہیں خواہاں
پر فکر ترے دین کی عزت کی سدا ہی

گر دین کو جوکھوں نہیں ذلّت سے ہماری
اُمت تری ہر حال میں راضی برضا ہی

عزّت کی بہت دیکھ لیں دنیا میں بہاریں
اب دیکھ لیں یہ بھی کہ جو ذلت میں مزا ہی

ہاں حالیِ گستاخ نہ بڑھ حدِ ادب سے
باتوں سے ٹپکتا تری اب صاف گِلا ہی

ہی یہ بھی خبر تجھ کو کہ ہی کون مخاطب
یہاں جنبشِ لب خارج از آہنگ خطا ہی

(۴۷) اوج ۱۹۱۷ء

اوج۔ میرزا محمد جعفر خلف الرشید حضرت دبیر۔ عربی۔ فارسی کی اچھی استعداد تھی۔ علم عروض میں کمال تھا اس فن میں آپ نے ایک رسالہ بھی تالیف کیا تھا۔ جو اُردو کی دنیا میں نہایت مقبول ہوا۔ جعفری بیگم صاحبہ کے اوقاف سے ان کو مرثیہ خوانی کے صلے میں ایک ہزار روپیہ سالانہ ملتا تھا۔ بعض تعلقہ داران اودھ بھی قدردانی فرماتے تھے۔ آپ اپنے باپ کے قابلِ فخر یادگار تھے سلام، مرثیہ، رباعی۔ سب کچھ کہتے تھے۔ مگر تمام اصنافِ سخن میں آپ کے سلام مطبوع خلایق ہوئے ستر برس کی عمر پائی۔ ۱۹۱۷ء مطابق ۱۳۳۵ھ میں انتقال کیا۔

سلام کا انتخاب یہ ہے

۱۵۷۔ سلام

خواہشیں دنیا کی بارِ دوش و گردن ہو گئیں
رفتہ رفتہ منزلِ عقبیٰ کی رہزن ہو گئیں

یہ ہوا کیسی چلی اس تنگ نائے دہر میں
شہر جنگل ہو گئے۔ آبادیاں بن ہو گئیں

چل سوئے گورِ غریباں اے حریصِ مال و زر
دیکھ کتنی آرزوئیں نذرِ مدفن ہو گئیں

کیسی رنگا رنگ شکلیں ہو گئی اے جوشِ بہار
مٹ کے جو گلگونۂ رخسارِ گلشن ہو گئیں

کھل نہیں سکتی کبھی کیفیتِ بغض و حسد
میری آہیں پردۂ ناموسِ دشمن ہو گئیں

میرے نغموں نے جو پائی قلبِ گلشن میں جگہ
شاخِ گل پر بلبلیں بارِ نشیمن ہو گئیں

جب مرے نالے ہوئے قدِ صنوبر سے بلند
بلبلیں ساکت سرِ دیوارِ گلشن ہو گئیں

جامۂ ہستی ہوا صد چاک جب مثلِ سحر
زینتیں دنیا کی گردِ دامن ہو گئیں

ہو سکے عون و محمد سے نہ سربر زرہ پوش
حق میں بیٹوں کے دعائیں ماں کی جوشن ہو گئیں

(۷۵) اسمٰعیل ۱۹۱۷ء

اسمٰعیل مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے

گورنمنٹ سنٹرل نارمل اسکول آگرہ میں مدرس فارسی تھے۔ جدید طرز کی نظم لکھنے والے شعرا میں ممتاز تھے۔ اُردو کے ساتھ فارسی بھی کہتے تھے۔ اُردو مدارس کے ابتدائی درجوں میں اُن کی مصنفہ کتابیں عرصے تک رائج رہیں۔ گورنمنٹ نے اُن کو "خان صاحب" کا خطاب دیا تھا۔ زبان کی سلاست۔ مضامین کی سادگی سے کلام کو ایسی مقبولیت ہوئی ہے کہ بچوں کو اُن کے اشعار نوک زبان ہو جاتے ہیں۔ کلیات اسمٰعیل نہایت اہتمام سے ۱۹۰۱ء میں چھپ چکا ہے۔ یکم نومبر ۱۹۱۷ء مطابق ۱۳۳۵ھ کو انتقال ہوگیا کلام کا انتخاب یہ ہے:-

غزل (۱۵۸)

جو بھلے بُرے کی اٹکل نہ مرا شعار ہوتا
نہ جزائے خیر پاتا۔ نہ گناہ گار ہوتا

مئے بے خودی کا ساقی! مجھے ایک جرعہ بس تھا
نہ کبھی نشہ اُترتا۔ نہ کبھی خُمار ہوتا

میں کبھی کا مر بھی رہتا۔ نہ غمِ فراق سہتا
اگر اپنی زندگی پر مجھے اختیار ہوتا

یہ جو عشق جاں ستاں ہے۔ یہ وہ بحرِ بے کراں ہے
نہ سُنا کوئی سفینہ کبھی اس سے پار ہوتا

کبھی بھول کر کسی سے نہ کرو سلوک ایسا
کہ جو تم سے کوئی کرتا تمہیں ناگوار ہوتا

ہے اس انجمن میں یکساں عدم و وجود میرا
کہ جو میں یہاں نہ ہوتا یہی کاروبار ہوتا

۱۵۹

مانعِ سرگشتگی وہ سنگِ در ہوتا نہیں
پھوڑنا سر کا علاجِ دردِ سر ہوتا نہیں

حیف دنیا! ہائے عقبیٰ! منزلِ دلبر ہے دور
دل جو اس رستے میں کھٹکا طے سفر ہوتا نہیں

یاد اور اُمید کی دولت سے کٹ جاتے ہیں دن
ورنہ غم کھانے سے دنیا میں گذر ہوتا نہیں

دعوئے اُلفت ہی کچا جو نہ ہو دل میں تپش
بے حرارت تو کبھی پختہ ثمر ہوتا نہیں

خوفِ جاں سے نامہ بر جانے کی ہامی کیوں بھرے
رشک سے یاں اعتبارِ نامہ بر ہوتا نہیں

صدمہ دل کو بوقتِ امتحانِ عشق ہے
بے پسے سرمہ بھی منظورِ نظر ہوتا نہیں

ہے شعورِ ماسوا بھی اک حجابِ آگہی
بے خبر جب تک نہ ہولے باخبر ہوتا نہیں

(۱۶۰) اچھے دنوں کی یاد

ایامِ وصال بھی تھے کیا دن
راتیں تھیں مراد مدعا دن

محسوس نہ تھا کہاں کٹی رات
معلوم نہ تھا کدھر گیا دن

کیا جلد گزر گئے وہ دن حیف!
ہوتا کوئی اور بھی سوا دن

تھی رات بہت دنوں سے اچھی — راتوں سے زیادہ خوب تھا دن

تھی بزم وصال۔ دن ہو یا رات — تھی دید جمال۔ شب ہو یا دن

دنیا میں بزرگ تھی وہی رات — تھا عمر میں بس وہی بڑا دن

ہر صبح عجیب۔ شام نادر — ہر رات جدید۔ اور نیا دن

تھی دن کو خوشی کہ اب ہوئی رات — تھی شب کو مسرت اب ہوا دن

عالم کو ہے بس کہ ہے تغیّر — رہتے نہیں ایک سے سدا دن

تھا خواب و خیال وہ زمانہ — بجلی ہوئی رات اور ہوا دن

دن رات یہی فغاں ہے لب پر
وہ رات رہی نہ وہ رہا دن

حصّہ دوم

شعرائے حال کے کلام کا انتخاب

اس حصّہ میں اُن شعرا کو لیا گیا ہی جو بوقت ترتیب تذکرہ یعنی جولائی ۱۹۲۱ء تک زندہ تھے اُن کو بہ لحاظ تاریخ ولادت درج کیا گیا ہی۔ لیکن نمبر سلسلہ دونوں حصّوں کا ایک ہی رکھا گیا ہی۔

---

۶۷ اکبر ۱۸۴۶ء

اکبر۔ خان بہادر مولوی سید اکبر حسین صاحب رضوی۔ دور موجودہ کے مشہور شاعر ہیں۔ ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء مطابق ۱۲۶۴ھ کو الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت امام موسیٰ رضاؑ تک پہونچتا ہی شاعری کے پردہ میں درستیٔ اخلاق خاص ان کا حصّہ ہی۔ کلام میں جدت بیشتر ہی۔ لیکن ظرافت کو صحت زبان پر مقدم رکھتے ہیں۔ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان ان کے کلام سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ انگریزی الفاظ اردو میں کھپانے کی بہت کوشش کرتے ہیں۔ جدید محاورات جو انگریزی اختلاط سے اُردو میں پیدا ہوتے جاتے ہیں ان کے یہاں اشعار میں

اکثر بندھے ہوئے ملینگے۔ حضرت وحید الہ آبادی شاگرد آتش سے تلمذ ہی دو دیوان شائع ہو چکے ہیں جو کلیات اکبر کے نام سے مطبوع خاص و عام ہیں۔ صوبۂ متحدہ میں جج رہے تھے سنہ ۱۹۰۳ء[۵] میں پنشن پائی۔ سنہ ۱۸۹۸ء میں خان بہادری کا خطاب ملا۔ نمونۂ کلام یہ ہی:-

۱۶۱ غزل

یہ موجودہ طریقے راہیِ ملکِ عدم ہونگے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہونگے

نئے عنوان سے زینت دکھائینگے حسیں اپنی
نہ ایسا پیچ زلفوں میں نہ گیسو میں یہ خم ہونگے

نہ خاتونوں میں رہ جائیگی پردے کی یہ پابندی
نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجبِ روئے صنم ہونگے

بدل جائیگا اندازِ طبائع دورِ گردوں سے
نئی صورت کی خوشیاں اور نئے اسبابِ غم ہونگے

نہ پیدا ہوگی خطِ نسخ سے شانِ ادب آگیں
نہ نستعلیق حرف اس طرح سے زیبِ رقم ہونگے

خبر دیتی ہے تبدیلِ ہوا تحریکِ موسم کی
کھلیں گے اور ہی گل زمزمے بلبل کے کم ہونگے

عقائد پر قیامت ڈھائیگی ترمیم ملت کی
نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہونگے

بہت ہونگے مغنی نغمۂ تقلید یورپ کے
مگر بے جوڑ ہونگے اس لئے بے تال و سم ہونگے

۵ اس تذکرہ کی تالیف کے وقت خان بہادر صاحب بقید حیات تھے۔ لیکن مطبع میں مسودہ بھیجے جانے کے بعد ۲ ستمبر ۱۹۲۱ء کو انتقال ہو گیا۔

ہماری اصطلاحوں سے زباں نا آشنا ہوگی — لغاتِ مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہونگے
بدل جائیگا معیارِ شرافت چشمِ دنیا میں — زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہونگے
گزشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی بھول جائینگے — کتابوں ہی میں دفن افسانۂ جاہ و حشم ہونگے
کسی کو اس تغیر کا نہ حس ہوگا، نہ غم ہوگا — ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہونگے

تمہیں اس انقلابِ دہر کا کیا غم ہی اے اکبر
بہت نزدیک ہی وہ دن نہ تم ہوگے نہ ہم ہونگے

(۲) شاد ۱۸۴۶ء

سیّد علی محمد نام ہی سادات عظّام سے ہیں۔ آپ کا سلسلۂ نسب ۳۲ واسطوں سے حضرت سیدنا امام زین العابدین سے ملتا ہی۔ سید حسین فیروزی بادشاہِ عراق و فارس جن کا ذکر خواجہ حافظ شیرازی نے اپنے اس شعر میں کیا ہی آپکے اجداد میں تھے ؎

راستی خاتم فیروزۂ بو اسحاق — خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود

۱۹ محرم ۱۲۶۲ھ مطابق جنوری ۱۸۴۶ء کو عظیم آباد (پٹنہ) میں پیدا ہوئے فارسی عربی میں کامل استعداد ہی پنگل (عروض ہندی) سے بھی واقفیت ہی۔ اپنے تصنیف کردہ اشعار کی تعداد مولانا نے خود ایک لاکھ سے چند ہزار زائد لکھی ہی۔ آپ کی تصانیف میں تاریخ صوبۂ بہار۔ "مردم دیدہ" وغیرہ مشہور ہیں۔ ان کے

علاوہ آپ نے حال میں ایک نئی کتاب "فکرِ بلیغ" لکھی ہے جس میں اردو کے تاریخی حالات۔ میر انیس۔ دبیر۔ ضمیر۔ خلیق وغیرہ مشہور مرثیہ گو شعرا کے سوانح ان کے کلام کا انتخاب اور اس پر تنقید ہے۔ اس کی اشاعت سے اردو ادب میں مفید اضافہ ہوگا۔ افسوس ہے کہ آپ کا کلام دیوان کی صورت میں ابتک شائع نہیں ہوا۔ ۱۹۱۵ء میں گورنمنٹ سے خان بہادری کا خطاب پایا اور ۱۹۳۰ء میں پبلک نے ادبی خدمات کا اعتراف کر کے سید الشعرا کے لقب سے ممتاز کیا۔ کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

۱۶۲ غزل

ہم سے نہ حق ادا ہوا عشق کرشمہ ساز کا
شکوہ کریں تو کیا کریں جانِ بہانہ ساز کا

ہجر میں اے دلِ حزیں جو ہوا خیر وہ ہوا
لب بھی ہلانا منع ہے مجھ سے امینِ راز کا

ہوگی جب اپنی آنکھ بند آئیگا وہ بھلا کبھی
دیکھ سکا نہ جو سماں دیدۂ نیم باز کا

بوسۂ سنگِ آستاں مل نہ سکا ہزار حیف
آگے قدم نہ بڑھ سکا ہمتِ سرفراز کا

اے دلِ مضطرب ٹھہر وقتِ سوال بھی تو ہو
مجھ کو بھی نام یاد ہے اپنے گدا نواز کا

جلوۂ حسن کی طرف دیکھ تو کچھ پتا چلے
جانے دے دل نہ پوچھ عاشقِ پاکباز کا

تشنۂ چشم رہ گیا کھول کے آنکھ اسی طرح
ذکر کسی نے کیوں کیا اُن کی نگاہِ ناز کا

پار لگائیگا وہی اپنی شکستہ ناؤ بھی
دل کو نیا دیا خدا جس نے مرے جہاز کا

اُن کے پیام کا جواب کس نے کہا کہ نالہ دے
کوئی علاج کیا کرے ایسے زباں دراز کا

قصۂ ہجر تا کجا تھک بھی چلے مری زباں
ہو بھی تو خاتمہ کہیں اس گلۂ دراز کا

پیرِ مغاں کے بھجنے دیکھ چلے ہو واعظو
تم نہ پیو جو مَے تو خیر حکم تو دو جواز کا

خاک بہت سی چھان کر دشت و جبل سے ہم پھرے
شاد پتا ملا نہ آہ قافلۂ حجاز کا

۱۶۳

آئی خزاں بہار کا موسم نکل گیا
کیوں اے نسیم تیرا کلیجہ نہ ہل گیا

اس باغ میں بہارِ خزاں کچھ نئی نہیں
دل کیا بدل گیا کہ زمانہ بدل گیا

قاصد مریضِ عشق سدھارا جہان سے
اب کے پیامِ وصل کا جادو نہ چل گیا

۱۶۴

سہی کس نے ہی کون تیری سہے گا
نہ کوئی رہا ہی نہ کوئی رہے گا

ترا نام کیوں غیر لے میرے آگے
مرا دل بھی دل ہی کچھ آخر کہے گا

زمانے سے ہم تو گزر جائینگے خود
زمانہ مگر آپ کو کیا کہے گا

یہ دنیا ہی اے شاد ناحق نہ الجھو
ہر اک کچھ تو اپنی سی آخر کہے گا

۱۶۵

غفلت میں ہوئے اوقات بسر اے عمر گریزاں کچھ نہ کیا
کی فکر وصال یار بہت لیکن سر و ساماں کچھ نہ کیا
جنبش سے تری منتقل ہوتا اک آن میں دشتِ کرب و بلا

عشاق کی تباہی کے عوض اے ابروئے بتّاں کچھ نہ کیا
اُلٹا نہ عراق و شام و حلب دنیا نہوئی ویراں تو کیا
جل تھل نہ لہو سے تو نے بھرا تو خونِ مسلماں کچھ نہ کیا

اے ننگ جہاں اے شاد بتا کچھ آئی تجھ کو شرم و حیا
اے جہل مرکب اے حیوان اے بے خبر انساں کچھ نہ کیا

(۱۶۶)

وہ کیسی نعمت تھی اے محبت کہ جس نے ہر شخص کو مٹایا
نہ نیست ہونے کا جی میں کھٹکا نہ ہست کا لطف کوئی پایا
نظر میں ویراں ہی بزم عالم بغیر دل کے یہ ہم نے پایا
جو دل پہ الزام ہی گیا کیوں ہمیں نے خود دے کے کیا بنایا
امید اور وہ بھی کس کی اے دل وصال سی شئی کی۔ اف نہ پوچھ کہہ
ہمیشہ دھوکے پہ کھائے دھوکے ہمیشہ رہ رہ کے آزمایا
کہاں یہ ریشِ سفید اپنی کہاں جوانوں کی بزم ساقی
برا ہو اس شوق کا الٰہی ہمیں بھی کافر لگا کے لایا
اُنھیں جو منظور دیکھنا ہو تو آکے ایسے میں دیکھ جائیں
دیا سہارا مریضِ غم نے چراغ رہ رہ کے جھلملایا
تباؤ للہ منصفی سے یہ تذکرہ کر رہا ہوں دل کا

یہی وفا تھی یہی مروت کہ پھر گے شامت زدہ نہ آیا

۷۸ اثر ۱۸۴۹ء

اثر۔ شمس العلما دجناب مولوی نواب سید امداد امام صاحب بہادر رئیس اعظم پٹنہ۔ ۱۷۔ اگست ۱۸۴۹ء کو آپ کی ولادت ہوئی۔ خاندان سادات کرام سے ہیں۔ علوم مشرقی و مغربی میں کامل دستگاہ رکھتے ہیں بالخصوص فن طبابت میں بہت زیادہ توغل ہے۔ ۵۴ برس سے خلق خدا کی طبی خدمت کر رہے ہیں۔ آپ کی شاعری کا خاص رنگ ہے۔ فطرتی جذبات محققانہ مسائل عاشقانہ واردات کو تغزل کے رنگ میں نبھانا آپ ہی کا حصہ ہے اس کے ساتھ ہی بلند پروازی کو جو غزل سرائی کی جان ہے ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ آپ کا دیوان چھپ چکا ہے۔ شاعری کے فن میں آپ نے ایک کتاب کاشف الحقائق لکھی ہے۔ جس میں مشہور شعرائے اردو کے کلام پر تنقید کی گئی ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

۱۶۷ غزل

یہی نہیں ہے کہ دل کی دھڑکن رہیگی جب تک کہ جاں رہیگی
یقیں ہے اس کا کہ بعد مردن لحد بھی اپنی تپاں رہے گی
بہار عیش و نشاط کیسی، شگفتہ کیوں ہوں گل تمنا

ترے گلستاں میں بلبلِ دل خزاں رہی ہی خزاں رہیگی

شبابِ شاعر ہی عہدِ پیری۔ کلام کا زور کم نہ ہوگا
رہیگی جبتک کہ جاں بدن میں طبیعت اپنی رواں رہیگی

وہ نعمتیں ہیں تری خدایا کہ وجد ہوتا ہی جن سے دل کو
رہیگی فرطِ طرب سے رقصاں دہن میں جبتک زباں رہیگی

چھپاؤں میں لاکھ سوزِ غم کو فغاں کا شعلہ بھڑک اٹھیگا
دل و جگر جب اثر جلیں گے یہ آگ کیونکر نہاں رہیگی

۱۶۸

جفا پرور سے امیدِ وفا کیا
عدو کے جور کا تجھسے گلا کیا

غرض دلدادگی کی چاہتے ہیں
کروں میں اُن سے عرضِ مدعا کیا

نہیں جب جوہرِ مردم شناسی
ستایش ہائے دشمن کا گلا کیا

سپاسِ طالعِ نیکو چہ معنی
شکایت ہائے بختِ نارسا کیا

عدو سُن کر نہ چومے دستِ قاتل
دہانِ زخم شورِ مرحبا کیا

سراپا جلوۂ رنگِ وفا ہی
دلِ خوں گشتہ کے آگے حنا کیا

قطعہ

صبا آوارہ و گل نذرِ صرصر
چمن کی ہوگئی اگلی ہوا کیا

فروغ جلوۂ گل عارضی ہی
تماشائے بہارِ بے بقا کیا
عبث کرتی ہی بلبل ماتمِ گل
غمِ بربادیٔ اہلِ فنا کیا

اثر موہوم ہی مضمونِ ہستی
نہیں معلوم ہی کیا اور تھا کیا

۱۶۹

جفائیں ہوتی ہیں گھٹتا ہی دم ایسا بھی ہوتا ہی
مگر مجھ پر جو ہی تیرا ستم ایسا بھی ہوتا ہی
عدو کے آتے ہی رونق سدھاری تیری محفل کی
معاذ اللہ انساں کا قدم ایسا بھی ہوتا ہی
رکاوٹ ہی خلش ہی چھیڑ ہی ایذا پہ ایذا ہی
ستم اہلِ وفا پر دم بہ دم ایسا بھی ہوتا ہی
حسینوں کی جفائیں بھی تلون سے نہیں خالی
ستم کے بعد کرتے ہیں کرم ایسا بھی ہوتا ہی
نکر شکوہ ہماری بے سبب کی بدگمانی کا
محبت میں ترے سر کی قسم ایسا بھی ہوتا ہی
نہ ہو دردِ جدائی سے جو واقف اس کو کیا کہیے
نہیں وہ دیکھ کر کہتے ہیں غم ایسا بھی ہوتا ہی

بتوں کے ملنے جلنے پر نہ جانا اے دلِ ناداں
بڑھا کر ربط کر دیتے ہیں کم ایسا بھی ہوتا ہے

ہمیں بزمِ عدو میں وہ بلاتے ہیں تمنا سے
کرم ایسا بھی ہوتا ہے ستم ایسا بھی ہوتا ہے

ہوا کرتا ہے سب کچھ اے اثرؔ اس کی خدائی میں
کریں دعویٰ خدائی کا صنم ایسا بھی ہوتا ہے

۱۷۰

اے نو رسیدگانِ جوانی ذرا سنو
ملتا تھا لطف ارست ہمیں بھی شباب میں

اِک دن وہ تھا کہ ساقیِ مہوش تھا پاس
پیتے تھے ہم شرابِ شبِ ماہتاب میں

وہ بُت کہ دل کو حلقۂ دامِ بلا میں لائیں
زلفیں تھیں جن کی تا بہ کمر پیچ و تاب میں

آنکھوں کے سامنے سے الٰہی کدھر گئے
اب تو نظر بھی آتے نہیں ہم کو خواب میں

احبابِ بزم جتنے تھے سب ہو گئے ہوا
گویا شراب پیتے تھے جامِ حباب میں

ہر لحظہ اُن کی یاد میں روئیں نہ کیوں اثرؔ
تصویریں اُن کی پھرتی ہیں چشمِ پر آب میں

۱۷۱

سُنا حالِ دل پر کہا کچھ نہیں
مگر کان دھر کر سُنا کچھ نہیں

مقدر میں جو تھا وہ تم نے کیا
بتو تم سے ہم کو گلہ کچھ نہیں

شب ہجر ہونا چلا میں فنا
سحر ہوتے ہوتے رہا کچھ نہیں

نہ گل پر ہی جوبن نہ بلبل کو جوش
چمن کی وہ اگلی ہوا کچھ نہیں

عبادت خدا کی بہ اُمید حور
مگر تجھ کو زاہد حیا کچھ نہیں

خدا اُن سے بندوں کو اپنے بچائے
کہ نزدیک جن کے خدا کچھ نہیں

حسینوں کے انداز مت پوچھئے
جفا ہی جفا ہے وفا کچھ نہیں

بتوں کی پرستش کہاں تک اثرؔ
مگر تجھ کو خوفِ خدا کچھ نہیں

۱۸۲

اپنی نظروں میں چھپے خود رُخِ زیبا ہو کر
آپ کو دیکھتے ہیں آپ تماشا ہو کر

دیکھ ثابت قدمی اہلِ وفا کی اپنے
تیرے کوچہ میں رہے نقش کفِ پا ہو کر

اپنے مطلب کا ہوا کرتا ہے دیوانہ بھی
قیس صحرا کو گیا کوچۂ لیلیٰ ہو کر

کیا ترا ساتھ ازل میں نہ ہوا تھا مجھ کو
میں نہ پہچانوں تجھے تیرا شناسا ہو کر

دشت میں ڈھونڈھنے جب قیس کو لیلیٰ نکلی
رہنما شوق ہوا جادۂ صحرا ہو کر

ایک جانب سے محبت نہیں پاتی انجام
میں ترا ہو گیا ہوں تو رہے میرا ہو کر

طور ہی طور ہے صحرا اسے طلب میں لیے
ذرّہ ذرّہ ارنی کہتا ہے موسیٰ ہو کر

خضر و موسیٰ کی حکایت سے عیاں ہوتا ہی
جلوہ فرمائیاں کیں آپ نے کیا کیا ہو کر

آج کیوں صحبتِ احباب پہ مرتا ہے اثرؔ
[illegible] یہ مدفن میں تجھے کل رہنا ہے تنہا ہو کر

۷۹ حافظ سنہ ۱۸۵۶ء

حافظ - قاضی خلیل الدین حسن ولد قاضی بشیر الدین احمد صدیقی عبدالرحمانی پیلی بھیت کے شرفا میں ہیں اور وہیں وکالت کرتے ہیں - آنریری مجسٹریٹ بھی ہیں - حافظ قرآن ہیں - دو مرتبہ حج کعبہ و زیارت روضۂ منورۂ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف ہو چکے ہیں - ہندوستان کے نعت گو شعرا میں آپ کا کلام بہت مشہور ہے - اپنے ماموں قاضی ممتاز حسین صاحب ممتاز کے شاگرد ہیں - فارسی شعر گوئی کا بھی ملکہ ہے - علم عروض و معانی و بیان پر عبور ہے نہایت ستھرا صاف اور پاکیزہ شعر کہتے ہیں -

کلام کی تنقید اور شعر کے حسن و قبح سمجھنے میں خداداد ملکہ ہے - وضع دار خوش اخلاق ہیں ۶۹ سال کی عمر ہے - پانچ دیوان نعتیہ نظامی پریس بدایوں میں طبع ہو چکے ہیں چھٹا مرتب ہے - عاشقانہ شاعری چالیس برس سے ترک کر دی ہے - آپ کی تاریخ پیدائش ۲۴ر جولائی ۱۸۵۶ء مطابق ۵ رمضان ۱۲۷۲ھ ہے نمونۂ کلام یہ ہے -

رباعیات

۱۶۳

دنیا تیری قدرت کی تماشائی ہے
چھائی ہوئی سب پر تری یکتائی ہے
جلوہ ہے دوئی میں بھی تری وحدت کا
دو آنکھیں ہیں اور ایک بینائی ہے

۱۶۴

دنیا سے ضرور کوچ کرنا اک روز
ہے سرحد ہستی سے گزرنا اک روز

جینے سے زیادہ فکر مرنیکی کرو
جینا ہے تمام عمر مرنا اک روز

۱۷۵

گوہر کو کرے جمع یہ جوہر ہے تو کیا
جب نفس غنی نہیں۔ تونگر ہے تو کیا
جب جود نہیں، کرم نہیں، فیض نہیں
مٹھی ہیں جو غنچے کی طرح زر ہے تو کیا

۱۷۶ غزل

دل کو حسرت آئی تھی کوتاہیٔ تقدیر پر
جنبش مژگاں سے چل کر تیر پہنچے تیر پر

دانہ دانہ کر کے جب قسمت نے کی تقسیم رزق
نام دیوانوں کا لکھا دانۂ زنجیر پر

دل کے پردے میں وہ صورت ہے کہ چھپ سکتی نہیں
ایک آئینہ لگا ہے صاف اس تصویر پر

روتے روتے بندھ گئی ہچکی دم عرض سوال
اور پھندا پڑ گیا الجھی ہوئی تقریر پر

جب کوئی آئی مصیبت آئی دل کوتا کتی
جب کبھی ٹوٹی خرابی ٹوٹی اس تعمیر پر

کل ہم آئے آج رخصت صبر اب کیونکر کریں
ہجر کی تعجیل پہ یا موت کی تاخیر پر

ہند سے حافظ دوبارہ چل کے آیا ہے حضور
اک نظر ہو اس گدائے بے نوائے پیر پر

۸۰ شوق ۱۸۵۳ء

شوق - شیخ احمد علی ولد کاظم علی قدوائی - قصبۂ جگور ضلع بارہ بنکی کے باشندے ہیں تقریباً ۱۸۵۳ء اِن کا سالِ ولادت ہی - فنِ شعر میں حضرت اسیر کے شاگرد ہیں - سادگی - بے تکلفی اعلیٰ جذبات کے سوا - اردو کے محاورے نظم میں خوب کھپاتے ہیں - اِن کی ابتدائی تعلیم بدایوں کے اسکول میں ہوئی - اس کے بعد ریاست رام پور میں طالبعلی کرتے رہے - عرصہ ہوا کہ لکھنؤ میں آزاد نامی اخبار نکالا تھا - اُس کے بعد پرتاب گڈھ اور بھوپال میں ملازم رہے - فی الحال ریاست رامپور میں ہیں اور دفتر حامد اللغات میں علمی خدمات انجام دے رہے ہیں - ڈراما "قاسم وزہرا" - مثنوی ترانۂ شوق اور چند معنی خیز نظمیں ان کے افکار کا نتیجہ ہیں - دیوان ہنوز شائع نہیں ہوا ہی - کلام کا انتخاب یہ ہی :-

۱۷۷ غزل

روح کو آج ناز ہی اپنا وقار دیکھ کر
اُس نے چڑھائیں تیوریاں میرا قرار دیکھ کر

قصدِ گلہ نہ تھا مگر حشر میں جوشِ شوق سے
ہاتھ مرا نہ رُک سکا دامنِ یار دیکھ کر

دیکھ کے ایک بار انھیں دل سے تو ہاتھ دھو چکے
دیکھیے کیا گزرتی ہی دوسری بار دیکھ کر

آتے ہیں وہ تو پہلے ہی رنج سے صفا ہو ہو
آکے کہیں پلٹ نہ جائیں دل میں غبار دیکھ کر

وصل سے گزرے اے خدا ہاں یہ شگون چاہیئے
صبح کو ہم اُٹھا کریں روئے نگار دیکھ کر

کعبے کو جا نہ شوق ابھی نیت زندگی بخیر
ہم بھی چلیں گے تیرے ساتھ اچھے بہانا دیکھ کر

۸۱ منشی سنہ ۱۸۵۴ء

شیخ امیر علی ولد شیخ محمد حسین وطن قدیم اکبر پور ضلع فیض آباد - مولد و مسکن لکھنؤ مفتی گنج - پیدائش ۱۵ صفر سنہ ۱۲۳۱ھ نظیر علی تاریخی نام ہے- منشی تخلص ہے- فارسی و عربی میں اچھی دستگاہ ہے- لکھنؤ کے مشہور شعرا کی صحبتیں دیکھی ہیں کسی سے تلمذ نہیں ہے- فارسی میں بھی شعر کہتے ہیں- کبھی کلام کے جمع کرنے کی طرف توجہ نہیں فرمائی- عرصہ ہوا آپ کا ایک قصیدہ موسومہ نیرنگ روزگار جس میں زمانے کا نقشہ کھینچا گیا ہے احباب کے اصرار سے چھپا تھا- ۴۲ برس سے ترک وطن کر دیا ہے- سالہا سال ٹونک بھی رہے آج کل حیدرآباد مقام ہے- کلام کا نمونہ یہ ہے:-

۱۷۸ غزل

ذرا انصاف سے کہیے کہ ہمت کس کی زر نکلی
جفاؤں کے مقابل ہیں وفا تنہا اگر نکلی

ابلنے کی جگہ طوفانِ عہدِ نوح کے آخر
تنور بیوہ کے پردہ میں میری چشم تر نکلی

حسابِ غم کیا سب اپنا اپنا پاک یاروں نے
یہ دیکھو خوبیِ قسمت کہ باقی میرے سر نکلی

ہزاروں حسرتیں دل میں سے مہمان بن بیٹھیں
نہ لائی تاب مہمانوں کی جان ادھر چھوڑ کر نکلی

۱۷۹

کیا حال پوچھتے ہو مجھ آشفتہ رنگ کا
سودائے زلف سر میں ہے ایک شوخ و رنگ کا

پھیری نگاہِ ناز اِس انداز خاص سے
جس سے نباہ ہی چل نہ سکا صلح و جنگ کا

اِن ہرزہ گویوں سے تو ملتی پڑھو درود
سمجھے ہوئے ہو کیا یہ زمانہ امنگ کا

۱۸۰

شراب و ساقی و مطرب چھٹیں یہ ہو نہیں سکتا
سیہ نامہ مرا کیا ابرِ رحمت دھو نہیں سکتا

شہیدِ عشق ہوں گم گشتۂ وادی الفت ہوں
کہو خضر و مسیحا سے کہ اب کچھ ہو نہیں سکتا

دلِ آشفتہ زلفِ پرشکن کے پیچ میں آیا
قیامت تنگ تو پھندے سے نکلنا ہو نہیں سکتا

۸۳ نظم ۱۸۸۵ء

نظم ۔ سید علی حیدر طباطبائی لکھنؤ کے رہنے والے خاندان سادات سے طباطبا کی اولاد میں ہیں ۔ مختلف مشرقی علوم میں مہارت رکھتے ہیں ۔ فن شعر میں تحقیق کا درجہ حاصل ہے ۔ شاعری میں کسی کے شاگرد نہیں ہیں ۔ آپ سب سے پہلے کلکتہ میں واجد علی شاہ کے شہزادوں کو عربی تعلیم دینے کے واسطے مقرر

کئے گئے تھے ۱۸۸۷ء میں واجد علی شاہ کا انتقال ہو جانے پر حیدر آباد دکن چلے آئے۔ یہاں مختلف عہدوں پر ممتاز رہے۔ نظام کالج کے عربی پروفیسر رہے ہیں۔ حیدر جنگ کا خطاب پایا ہی۔ آپ نے دیوان غالب اردو کی ایک مبسوط شرح لکھی ہی۔ جس میں شاعرانہ نکات اور فن سخن کے متعلق قابل قدر معلومات کو جمع کیا ہی۔ غزلیات کے علاوہ حالیہ نظمیں بھی لکھتے ہیں۔ دیوان کا انتخاب مولانا حسرت موہانی نے اپنے اردوئے معلی پریس علی گڑھ سے شائع کیا ہی ۱۲ محرم ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۴ء تاریخ پیدائش ہی۔ نمونۂ کلام یہ ہی۔

(۱۸) جوشِ گل

وہ موسم ہی کہ خوبانِ چمن بنتے سنورتے ہیں
یہ عالم ہی کہ جیسے رنگ تصویروں میں بھرتے ہیں

ہی خوابیدہ جو سبزہ آئنہ خانے میں شبنم کے
نفس دزدیدہ بادِ صبح کے جھونکے گزرتے ہیں

پر طوطی پہ ہوتا ہی دُمِ طاؤس کا دھوکا
ہوا سے اُڑ کے برگِ گل جو سبزے پر بکھرتے ہیں

ملا ہی سبزۂ نوخیز کو کیا رنگِ زنگاری
ہوا گلشن سے جس کی زخمِ دل لالے کے بھرتے ہیں

شگوفہ زیرہ ہو کر ڈالیاں مدہوش کرتی ہیں
کہ مَے کش جانتے ہیں طاق سے شیشے اُترتے ہیں

نزاکت ادا سے جھوم کر کہتی ہی شاخِ گل
یونہی اک جام پی کر رنگ مستوں کے نکھرتے ہیں

بشاشت کہہ رہی ہی چہرۂ گل کی ادھر دیکھو
یونہی محفل میں ہنس دیتے ہیں پیمانے جو بھرتے ہیں

چمن کی بزم کے شاخیں ایسے کرتی ہیں گلبازی
گلوں کی آئنہ داری پہ طاؤس کرتے ہیں

گماں ہوتا ہی کی لشکرکشی بادِ بہاری نے
زرہ پوش آب ہو جاتا ہی جب بادل گزرتے ہیں

دمِ صبح بہاری ہو رُخِ خور پر نقاب افگن
وہیں جا کر جھمگا کاروانِ لالہ و گل بھی
نہالانِ چمن کر لیں گے قبضہ سارے عالم پر
زمیں پر جال پھیلایا ہے گو سوسن لفِ سنبل نے
جوابِ جشنِ جم ہو گرمیٔ ہنگامۂ گلشن
عنادل مل چکے ہیں خاک میں جو کیا خبر اُن کو

کسی آئینے پر تارِ نفس جیسے بکھرتے ہیں
نسیمِ صبح کے جھونکے جہاں جا کر ٹھہرتے ہیں
وہاں سے پھر نہیں ہٹتے جہاں یہ پاؤں دھرتے ہیں
عنادل اِن دنوں آتے ہوئے گلشن میں ڈرتے ہیں
کہ لے کر کشتیٔ زر تحفت پریوں کے اترتے ہیں
کہ شاخیں جھومتی ہیں پھول تربت پر بکھرتے ہیں

۱۸۲

ہنسی ہنسی میں وہ بات کہہ دی کہ رہ گئے آپ دنگ ہو کر
چھپا ہوا تھا جو راز دل میں کھلا وہ چہرے کا رنگ ہو کر
شباب و پیری کا آنا جانا غضب کا پُر درد ہے فسانہ
یہ رہ گئی بن کے گردِ حسرت۔ وہ اُڑ گیا رُخ سے رنگ ہو کر
جو راز دل سے زباں تک آیا تو اُس کو قابو میں پھر نہ پایا
زباں سے نکلا کلام بن کر۔ کماں سے چھوٹا خدنگ ہو کر
غضب ہے بحرِ فنا کا دھارا کہ مجھ کو اُلجھا کے پار اُتارا
نفس نے موجوں کا جال بن کر۔ لحد نے کامِ نہنگ ہو کر
جگر خراشی سے پائی فرصت نہ سینہ کاوی سے ناخنوں نے
گلا گریباں نے گھونٹ ڈالا جنوں کی شورش سے تنگ ہو کر

بدل کے دنیا نے بھیس صدہا رسے ڈرایا اُسے لبھایا
کبھی زنِ پیرِ زال بن کر۔ کبھی بتِ شوخ و شنگ ہو کر
اُٹھے تھے تلوار کھینچ کر تم تو پھر تامل نہ چاہیئے تھا
کہ رہ گئی میرے دل کی حسرت شہیدِ تیغِ درنگ ہو کر

جو ولولے تھے وہ دب گئے سب ہجومِ لیت و لعل میں حیدر
جو حوصلے تھے وہ دل ہی دل میں ہے دریغ و درنگ ہو کر

۱۸۳ گلاب کا پھول

قطعہ

گلگشتِ باغ میں نظر آیا یہ صبح دم
اک گل فرازِ شاخِ چمن آشکار ہے

پوچھا یہ میں نے دیکھ کے اُس کا فروغِ حسن
کس نازنین کا تو چراغِ مزار ہے

معلوم ہو رہا ہے گریباں کے چاک سے
شاید کسی کی خاک پہ تو سوگوار ہے

کہنے لگا کرے کوئی ماتم کسی کا کیا
اپنی ہی زیست کا نہیں کچھ اعتبار ہے

میں نے کہا ہمیشہ سے ہے یہ ترا شباب
کہنے لگا کہ چشمِ زدن کی بہار ہے

پوچھا یہ میں نے کان میں آتی ہے کیا صدا
بولا اجل کی جہاں میں پکار ہے

پوچھا برنگِ شعلہ تو لرزاں ہے کس لیے
بولا جگر میں زخم ہے پہلو میں خار ہے

میں نے کہا کہ زخمِ جگر کا ہے کیا سبب
کہنے لگا کہ تیغِ قضا سے فگار ہے

مین نے کہا پھری یہ چھری کس گناہ پر — اس نے کہا مشیت پروردگار ہی

پوچھا یہ رو کے مین نے کچھ اس کا نہین علاج — بولا یہ ہنس کے وہ مجھے کیا اختیار ہی

مین نے کہا کہ حیف تو کہنے لگا کہ حیف
جائے قرار ہی نہ تو پائے فرار ہی

۱۸۴۔ شہیر ۱۸۵۶ء

شہیر۔ سید محمد نوح۔ خلف سید رعایت علی۔ آپ مچھلی شہر ضلع جونپور کے تعلقہ دار ہیں۔ فن سخن مین حضرت منیر شکوہ آبادی سے تلمذ ہی۔ فارسی عربی مین مناسب لیاقت ہی۔ وکٹوریا کالج اور آگرہ کالج مین انگریزی کی تعلیم پائی ہی۔ فرخ آباد کے مشاعروں مین شریک اور مدتوں خواجہ بادشاہ سفیر خلف خواجہ وزیر مرحوم کے ہمنشین رہے اور اُن سے بھی افادۂ سخن حاصل کیا ہی۔ آپ کی تاریخ ولادت ۲۵ دسمبر سنہ ۱۸۵۶ء مطابق سنہ ۱۲۷۳ھ ہی۔

نمونۂ کلام یہ ہی:-

۱۸۴۔ غزل

سرسبز پھر مرا شجرِ مدعا ہوا — آئی بہار زخم جگر پھر ہرا ہوا

سہرا اُسی کے سر ہی شہادت کا ان دنوں — تیرا شہید ناز ہی دولھا بنا ہوا

تیرِ نگاہ دل سے جگر تک گزر گیا
آنکھوں نے اُن کی یہ بھی نہ جانا کہ کیا ہوا

اے بُت خدا سے مانگوں میں کیونکر دعائے وصل
پتھر کے نیچے ہاتھ ہے میرا دبا ہوا

شاید عرق فشاں دمِ رفتار ہے وہ شوخ
فتنے کے عطر سے ہے زمانہ بسا ہوا

پہنچا دیا گلی میں تری جوشِ اشک نے
طوفان بہرِ کشتیٔ دل نا خدا ہوا

کیا سبز ابرِ اشک سے ہو کشتِ آرزو
جب آج تک نہ سبزۂ مژگاں ہرا ہوا

تنقید اس غزل میں ہوئی کیونکر اے شہیر
دل زلف کی گرہ میں ہے شاید پھنسا ہوا

١٨٥

شبِ بلا داغِ آتشیں سے بھی تیرگی میں کمی نہیں ہے
یہ کیسا اندھیر ہے مرے گھر کہ چاند ہے چاندنی نہیں ہے

جفائے معشوق کا گلہ کیا کہ امتحانِ وفا ہے اس میں
جو ہو محبت کی آزمائش۔ وہ داخلِ دشمنی نہیں ہے

جو دار و منصور کا فسانہ سنا تو جی کانپ کانپ اُٹھا
کہ دل لگانا ہے جان جوکھوں یہ کچھ ہنسی دل لگی نہیں ہے

نہ جس سے کچھ مجھ کو نفع راحت۔ نہ غیر کی جان کا ضرر کچھ
وہ دوستی دوستی نہیں ہے۔ وہ دشمنی دشمنی نہیں ہے

بھڑک اُٹھے گی یہ آگ اک دن لگائی ہے جو دل و جگر میں
کہ اندر اندر سُلگ رہی ہے دبی ہوئی ہے جلی نہیں ہے

یہی ہے دل سوز سوزِ فرقت یہی ہے ہم دردِ دردِ ہجراں
سے سلامت اجل ہماری۔ ہمیں غم بے کسی نہیں ہے

نہیں رہی ہائے وہ جوانی کہ جس سے تھا لطفِ زندگانی
شہیر پیری وبالِ جاں ہے کہ جان ہے زیست کی نہیں ہے

۸۴ شاد سنہ ۱۸۶۴ء

شاد۔ سر مہاراجہ بہادر کشن پرشاد یمین السلطنت پیشکار و سابق مدار المہام دکن آپ مہاراجہ چندو لال آنجہانی کے نواسے اور جانشین ہیں۔ آپ کی ولادت ۱۸ ماہ جمادی الثانی ۱۲۸۰ھ بروز پنجشنبہ مطابق ۱۸۶۴ء حیدرآباد میں ہوئی۔ عربی فارسی۔ انگریزی کے سوا اور بھی چند زبانوں پر عبور ہے۔ اردو۔ فارسی اور بھاشا میں نظم و نثر قلم برداشتہ لکھتے ہیں۔ آپ کی طبیعت کا رجحان تصوف کی طرف بہت بڑھا ہوا ہے۔ بزرگوں کی خدمت اور کتب بینی نے آپ کے اس رنگ کو خوب پختہ کر دیا ہے۔ فن سخن سے خداداد مناسبت ہے حضرت آصف غفراں مکان سے شرف تلمذ ہے۔ طرز جدید و قدیم دونوں میں طبع آزمائی فرماتے ہیں۔ نظم و نثر کی متعدد تصانیف کے منجملہ آپ کا دیوان نعتیہ موسوم بہ "بتکدۂ رحمت"

شائع ہو کر مطبوع خلائق ہو چکا ہے۔ عاشقانہ دیوان اردو۔ و فارسی بھی زیر طبع ہے۔ کلام میں سلاست کا حصہ بہت زیادہ ہے جو آپ کی روانی طبع کا شاہد عادل ہے نمونۂ کلام یہ ہے:۔

۱۸۶ غزل

بادۂ خم خانۂ توحید کا مے نوش ہوں — چور ہوں مستی میں ایسا بیخود و مدہوش ہوں

گرد پھرنے دے مجھے ساقی یہ میرا فرض ہے — مثل ساغر دور میں ہوں بادہ سرجوش ہوں

طرزِ خاموشی مری بتلاتی ہے اس راز کو — ہوں نوا سنج حقیقت لاکھ میں خاموش ہوں

دردمندِ عشق ہو کر ضبط کا خوگر ہوں میں — صورتِ سیماب ہو کر پیکرِ خاموش ہوں

کس کی فرقت وصل کس کا اُدھر معشوق کون
شاد میں اس عالمِ تکویں کا ہم آغوش ہوں

۱۸۷

اگر ظاہر نہ ہر صورت میں صورت آفریں ہوتا — پتا اُس کا کہیں ملتا؟ نشاں اُس کا کہیں ہوتا؟

تمہارے وصل کا بے شک یقیں ہوتا یقیں ہوتا — کسی تدبیر سے بھی محو گر خط جبیں ہوتا

کسی کا ہو کے رہنا۔ یا کسی کو اپنا کر رکھنا — وہ تم سے ہو نہیں سکتا ہے یہ مجھ سے نہیں ہوتا

پلٹ کر دیکھ لیتا جاتے جاتے گر مرا قاتل — مجھے تجھ سے بھی سکو ملنے لگا وہ واپسیں ہوتا

نکلتا ناوکِ انداز گر نیچی نظر سے بھی — تو دل کے پار ہوتا۔ گر نہ ہوتا دل نشیں ہوتا

جو وہ بے پردہ ہو جاتا کلیم اللہ کی خاطر — قیامت تھی قیامت کا تماشا پھر وہیں ہوتا

حسین ہمدرد لاکھوں میں کوئی اک آدھ ملتا ہی
محبت کا اثر ہر ایک کے دل پر نہیں ہوتا

اگر پردہ دوئی کا دور ہو جاتا نگاہوں سے
تو مجنوں کو نہ ہجر لیلیٰ محمل نشیں ہوتا

کہاں ممکن ہی صبر و عشق دونوں کا بہم ہونا
جو یہ ہو وہ نہیں ہوتا جو وہ ہو یہ نہیں ہوتا

نہ لیتا امتحاں وہ بت اگر شیخ و برہمن کا
خدائی میں کسے پھر امتیاز کفر و دیں ہوتا

ہو الاول ہو الآخر ہو الظاہر ہو الباطن
یہ ظاہر ہی مگر پھر بھی کہیں ظاہر نہیں ہوتا

عبادت کے لیے بھی شاد اطمینان لازم ہی
پریشانی میں کوئی کام ہو۔ دل سے نہیں ہوتا

۸۵ بے نظیر ۱۸۶۳ء

سید محمد بے نظیر شاہ وارثی۔ سال پیدائش ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۸۶۳ء۔ عربی فارسی کے فاضل ہیں۔ انگریزی بھی جانتے ہیں۔ علم طب بھی پڑھا ہی۔ اس کے متعلق آپ کو جدید نباتات کی تحقیقات کا شوق ہی۔ اصل وطن کڑا مانک پور ضلع الہ آباد ہی۔ مدت سے حیدرآباد میں قیام ہی۔ فن شعر میں خاصی مہارت ہی۔ اردو غزل میں آپ مولانا وحید اللہ الہ آبادی مرحوم سے مشورہ لیتے تھے۔ قصیدہ اور مثنوی میں اکثر منشی امیر احمد مینائی سے اصلاح لی ہی۔ آپ کے کلام کا بہت بڑا حصہ ۱۸۹۵ء میں ایک سفر کے دوران میں گم ہو گیا۔ ایک مثنوی الکلام جس میں جابجا مناظر قدرت اور

صحیح جذبات کی تصویریں کھینچی گئی ہیں ۱۳۱۵ھ میں نول کشور پریس میں طبع ہوئی ہے
جس کا انتخاب ذیل میں دیا گیا ہے۔ غزل کا نمونہ یہ ہے۔

۱۸۸ غزل

نہ رہا حجابِ نیاز بھی جو نگاہِ اہلِ نیاز میں
تو رہا نہ تیرے سوا کوئی پسِ پردہ حسنِ مجاز میں

وہی عین ہے جو خیال ہے یہ مری حقیقتِ حال ہے
کہ شراب ہوں دمِ مے کشی تو نماز ہوں میں نماز میں

نہ ہوا پتی آنکھ جو حسن بیں تو جہاں میں کوئی حسیں نہیں
جو وہ غزنوی کی نگاہ ہو وہی خم ہے زلفِ ایاز میں

یہ عجیب پردۂ حال ہے کہ نقابِ حسنِ جمال ہے
جو نہاں بھی ہو کے عیاں رہے تو وہ راز ہے کوئی راز میں

یہ جہاں نہیں ہے یہ آئنہ ہے تصورِ ہمہ واہمہ
وہی جلوہ آئنہ ساز کا ہے نگاہِ آئنہ ساز میں

ہمہ تن تصورِ یار ہوں طربِ آشنائے نوید ہوں
کہ ترانہ کش ہے خموشیاں مرے دل کے پردۂ راز میں

مرے جرم کیا ہیں گناہ کیا تری شانِ لطف پہ میں فدا
کہ جلال میں بھی کمی نہیں ترے عفوِ بندہ نواز میں

جو اسیرِ بندِ بلا ہوئے وہی قیدِ غم سے رہا ہوئے
وہ پھنسے ہے جو پھنسے تھے ترے دامِ زلفِ دراز میں

تو چراغِ دیر و حرم ہے تجھے کیا پڑی ہے جو تو سنے
کہ تمام رات بسر ہوئی ہے کسی کی سوز و گداز میں

پسِ مرگ دادِ وفا ملی یہ مرادِ دستِ دعا ملی
کہ تری وفا نے اٹھا لیے مرے پھول دامنِ ناز میں

نہ عروج کچھ نہ نزول ہے یہ خیال و وہم فضول ہے
جو بلندیاں ہیں نشیب ہیں وہی پستیاں ہیں فراز میں

تری شکل کھینچ کے رکھ دیا جو قلم قضا نے سبب تھا
کوئی نقشِ حسن نہیں رہا سرِ کلکِ نقش طراز میں

یہ نوا جو شعلہ فروز ہے یہ دُکھیں جو سامعہ سوز ہیں
مرے سوز میں تری آگ ہے ترے راگ میں مرے ساز ہیں

دلِ زار ہند میں یوں ٹوٹ کے ہے مجھے دفن کوئی کہیں کرے
مری خاک بھی مری روح بھی تری رہگذر پہ ہو گی جا...

جو بنا یہاں وہی مٹ گیا جو مٹا یہاں وہی بن گیا
یہی بے نظیر رواج ہے رہِ عشق شعبدہ باز ہیں

۱۸۹

کیوں اس قدر جہان کی خاطر پہ بار ہوں
تیرا فراق ہوں نہ ترا انتظار ہوں

داغوں سے رنج و یاس کے ہیں لالہ زار ہوں
اس پر یہ داغ ہے تری آنکھوں میں خار ہوں

کیا ہو گی اس غریب کی بربادیٔ چمن
دعویٰ جہاں خزاں کو یہ ہو میں بہار ہوں

بہل اس گلی کی خاک میں دل اس پہ مل گئے
ہر ذرّہ کہہ رہا ہے کہ میں اک مزار ہوں

برباد ہو کے بھی مجھے اچھی جگہ ملی
دل سے ترے نکل نہ سکا وہ غبار ہوں

کر لیں گی خود اسیر مری نغمہ سنجیاں
صیاد گر ہے ایک تو میں بھی ہزار ہوں

آتے ہیں بدلیوں کے دل اے شوقِ میکدہ
گھوڑے پہ میں ہوا کے ابھی سے سوار ہوں

کیا شے ہے دردِ عشق مجھے کچھ خبر نہیں
کچھ تو مگر ضرور ہے جو بے قرار ہوں

کیا کم ہے اجرِ حسرتِ دیدار کا ملا
یہ بھی بہت ہے جو تری آنکھوں میں خار ہوں

یاد آ گئی وہ جنبشِ ابرو غضب ہوا
ہر آرزو یہ کہتی ہے خنجر کی دھار ہوں

بے ہوش ہو رہا ہوں خیالِ نگار میں
اللہ ہے جواب ہیں کبھی ہوشیار ہوں

چھایا ہے سارے باغ پہ رنگِ فغاں مرا
اس سے غرض نہیں کہ خزاں ہوں بہار ہوں

ساقی جو پی ہو غیر کے ہاتھوں سے تو حرام
رندی میں بھی یہ آن ہے پرہیزگار ہوں

دنیا سے اٹھ گیا میں فقط اس خیال سے
ایسا نہ ہو کہ آپ کی خاطر پہ بار ہوں

جو مردہ آرزو تھی وہ میرے ہی دل میں ہے
دنیا کی حسرتوں کا میں گویا مزار ہوں

اس آب و تاب سے بھی کھنچی ہے کہکشاں
اترا ہوا کسی کے گلے کا میں ہار ہوں

خود اپنے دل کی آگ سے جلتا ہوں [illegible]
رونق ہوں باغ دہر کی لیکن چنار ہوں

ساقی وہ آفتاب چھپا وہ اذاں ہوئی
دے جلد بھر کے جام کہ میں روزہ دار ہوں

زخمی تڑپ رہا ہوں مگر آہ بے نظیر
یہ بھی خبر نہیں کہ میں کس کا شکار ہوں

۱۹۰

نہ رہے اکیلے جنون میں بھی یہ تلاش ہمسفری رہی
خرد و حواس جو چل بسے تو جلو میں بے خبری رہی

ہوئے خشک پھول چمن جلا کہیں نام کو نہ تری رہی
یہی اپنے زخم ہرے رہے یہی اپنی آنکھ بھری رہی

وہ تری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مردے نکل گئے
یہ مری جبینِ نیاز تھی کہ جہاں دھری کی دھری رہی

بڑی احتیاط طلب ہے یہ جو شراب ساغر دل میں ہے
جو چھلک گئی تو چھلک گئی جو بھری رہی تو بھری رہی

نہ کدورت اپنی وفا میں ہے نہ غبار اپنی صفا میں ہے

اسے جس قدر بھی کسا گیا یہ کسوٹیوں پہ کھری رہی

جو تمیزِ حال ہوا ہوئی۔ طلبِ سکوں بھی فنا ہوئی

نہ دماغ میں وہ جنوں رہا نہ خیال میں وہ پری رہی

وہ ملال تھا کہ نکل گیا وہ خیال تھا کہ بدل گیا

مرے شکوے ایسے کبھی نہ تھے جو طبیعت ان کی بھری رہی

مری فردِ جرم کو دیکھ کر یہ خیال تھا کہ اٹھے نظر

یہی ایک شکل امید تھی وہی آج تک نظری رہی

تری تیغ بھی خضر تھی یہ اثر جو چل کے دکھا گئی

کوئی پنکھڑی گل زخم کی ہوئی خشک بھی تو ہری رہی

رہے باخبر تو نہ یہ کھلا کہ مآل و غایتِ عشق ہے کیا

ہوئے بے خبر تو خبر ہوئی کہ خبر سے بے خبری رہی

کوئی حشر تک بھی نہ لکھ سکا مرے کارِ بد تو بھلا ہوا

کہ قرار دادِ گناہ سے مری فردِ جرم بری رہی

تری چشمِ مست کی یاد تھی مری روح نزع میں شاد تھی

کہ شراب گو نہ میں پی سکا مرے سامنے تو دھری رہی

مجھے پاس وضع ضرور تھا یہ کمال عقل و شعور تھا
مری پردہ پوشیٔ جنوں، مری مشق پردہ دری رہی

تری خاک در مجھے مل گئی تو ہوس نہ دل میں رہی کوئی
نہ وہ کیمیا کی طلب رہی نہ طلب کی دربدری رہی

وہ ہزار در پے کیں رہا وہ ہزار پردہ نشیں رہا
وہی بے نظیر حزیں رہا وہی اس کی جلوہ گری رہی

۱۹۱

اس جگہ آ کر گرے ہم ٹھوکریں کھاتے ہوئے
وہ نکل جاتے ہیں اکثر سر کو ٹھکراتے ہوئے

اتنی مدت تو جنوں میں بھی رہا پابندِ وضع
شرم آتی ہے مجھے اب ہوش میں آتے ہوئے

دیکھنا اُس سے نہ کہدے کوئی میرے منہ کی بات
یہ بھی کہہ بیٹھے ہیں مجھ کو یاد فرماتے ہوئے

کچھ نہ لایا ساتھ کوئی، کچھ نہ کوئی لے گیا
دیکھ ڈالے سیکڑوں آتے ہوئے جاتے ہوئے

تیرے مجنوں اب چمن کی سیر سے بھوکے نہیں
مدتیں گزریں بیاباں کی ہوا کھاتے ہوئے

ہم نہ سمجھے تھے کہ بن جائے گی تیری جان پر
خیر اتنا تو کہا ظالم نے شرماتے ہوئے

منعِ بیجا کی قدر دانی دیکھ او ابرِ بہار
لے چلے میرا جنازہ پھول برساتے ہوئے

کر لیے پہلے تو ہر حلقے میں لاکھوں دل اسیر
اب اُلجھتے ہیں وہ کیوں زلفوں کو سلجھاتے ہوئے

اس لیے وہ پوچھتے ہیں ظلم اپنے بار بار
رنج ہوتا ہے مجھے یہ قصہ دہراتے ہوئے

معذرت اپنی نہیں سوجھی ہے کمالِ امید
دیر لگتی ہے وہاں کیا رحم فرماتے ہوئے

اس سفر میں ہر قدم پر مل گیا نوشتہ ہیں
پہونچے منزل پر برابر ٹھوکریں کھاتے ہوئے

تنگ تھا میدانِ عالم اے جنوں تو کس لیے
وسعتِ صحرا نہ دیکھی پاؤں پھیلاتے ہوئے

اس قدر ناکامیوں کا خوف رہتا ہے کہ اب
دل میں ڈرتا ہوں خیالِ آرزو لاتے ہوئے

آمد و شد میں جہاں کی صرف دو دم کا ہے فرق
ایک دم آتے ہوئے اور ایک دم جاتے ہوئے

مٹ گئی پامالیوں سے وہ بھی آخر بے نظیر
کچھ نشاں تھے جن کی تیروں کے ادھر جاتے ہوئے

۱۹۲

ترے رخ پہ جم کر نظر رہ گئی
کبھی ہم سے او فتنہ گر رہ گئی

ادھر رہ گئی یا ادھر رہ گئی
وفا کی شکایت مگر رہ گئی

ازل میں ہر انجام لکھا گیا
شبِ غم کی لیکن سحر رہ گئی

نہ کچھ بھی رہا تو بھی سب کچھ رہا
تری یاد دل میں مگر رہ گئی

کمی کر گئی کیوں نگاہِ عتاب
پہنچ کر سناں تا جگر رہ گئی

کبھی کہہ دیا تھا کہ مرتا ہوں میں
شکایت انھیں عمر بھر رہ گئی

میں اٹھنے کو اٹھا تو اس بزم سے
طبیعت وہیں بیٹھ کر رہ گئی

کہا اس نے دھوکے سے بالیں پہ تم
تری بات اسے چارہ گر رہ گئی

ادا سے وہ ٹھکرا کے چلتے ہوئے
قیامت مری جان پر رہ گئی

پھنسی دل میں تیری سناں ٹوٹ کر
یہ ظالم نہ رہتی مگر رہ گئی

مصیبت کو بھی داد مل جائے گی
مرے ساتھ کچھ دن اگر رہ گئی

کہاں جا کے ٹھنڈی ہوئی آہ گرم
پہنچ کر قریب اثر رہ گئی

خدا جانے آنکھوں میں اب کیا رہا
نظر تو ترے بام پر رہ گئی

پھر آئی نہ غربت میں یادِ وطن
وہ کم بخت بھی جا کے گھر رہ گئی

تری شامِ گیسو کی خوشبو کہاں
گلوں تک نسیمِ سحر رہ گئی

غنیمت ہے جس کو عداوت نہ ہو
محبت بس اب اس قدر رہ گئی

یہ کیا کم سزا سربلندی کی ہے
کہ جھک کر فلک کی کمر رہ گئی

چلا جب یہ کہہ کر پکارا اُسے
یہ بات اور اک نامہ بر رہ گئی

بلا ہی بلا تھی محبت تری
وہ قسمت سے میرے ہی سر رہ گئی

کوئی دم میں ہے ختم طولِ حیات
یہ منزل بہت مختصر رہ گئی

یہ کہتی ہے ہر داستانِ کہن
مسافر سدھارے خبر رہ گئی

کہاں عشق میں عقل کی یہ خبر
گئی کس قدر کس قدر رہ گئی

اُٹھے ہو کے مایوس ہر در سے ہم
بس اب اک تری رہگزر رہ گئی

بڑی خیر گزری کہ اے ضبطِ آہ
انھیں ہوتے ہوتے خبر رہ گئی

نہ توڑا انھیں غیر سے بے نظیر
محبت میں اتنی کسر رہ گئی

انتخاب از "مثنوی الکلام"

۱۵۳ برسات کا سماں

جو سوکھی زمیں پر ترشح ہوا — نکلتی ہی بُو سوندھی سوندھی سی کیا

گرجتے ہیں بادل چمکتی ہی برق — ہوا صحن کا صحن پانی میں غرق

گئی نیند اچٹ پانی کے شور سے — بہی جاتی ہیں نالیاں زور سے

ٹپکتی ہی بنگلے کی وہ اولتی — کہ ہی تارِ سیمیں کی چلمن پڑی

ہوا زور سے چلتی ہی بار بار — پہنچتی ہی کمروں کے اندر پھوار

بنا ہی جو وہ ٹین کا سائبان — ہی اِس وقت ارگن کا اس پر گمان

عجب لَے سے پانی برستا ہی آج — کہ زاہد بھی مَے کو ترستا ہی آج

چٹانوں پہ کیا لطف نظارہ ہی — کہ جو بوند ہی ایک فوارہ ہی

صبا کے طپانچے جو کھاتے ہیں آج — تو پودے سروں کو جھکاتے ہیں آج

چلی آتی ہی بدلیوں کی قطار — ہوا کے ہیں گھوڑے پہ بادل سوار

دھواں دھار اس وقت چھایا ہی ابر — فلک پر سیہ مست آیا ہی ابر

اُٹھی شاخ گل سبزہ کو چوم کر — برستی ہی کیا کیا گھٹا جھوم کر

ہیں آراستہ سبز پوشانِ باغ — ہوا غسل سے ہر شجر کو فراغ

یکایک رکی بوند ٹھہری ہوا — نظر آتی ہے اور ہی کچھ فضا

۹۴ صبح کے وقت طلوع آفتاب کا منظر

ہے کچھ دھوپ کا عکس کہسار پر — شعاعیں چمکتی ہیں اشجار پر
تری اوس کی دھوپ کھونے لگی — ہوا بھی ذرا گرم ہونے لگی
پرندے زمیں پر اترنے لگے — ہرن کھل کے جنگل میں چرنے لگے
اُڑے کھول کر قاز و سرخاب پر — گرے مرغ آبی وہ تالاب پر
وہ کھیتوں میں چڑیاں بھی آنے لگیں — وہ چن چن کے دامن اٹھانے لگیں
ہوا پھر وہی کار و بارِ جہاں — ہوئے لوگ مصروف کارِ جہاں
ہوا میں ابھی تک نہیں کچھ غبار — رطوبت لگی اڑنے بن کر بخار
مگر شہر میں یہ نہیں آب و تاب — کہ ٹیلوں کی ہے اوٹ میں آفتاب
بلندی پہ کچھ دھوپ آنے لگی — وہ کلسوں پہ سونا چڑھانے لگی
منڈیروں پہ کچھ کچھ جھلکنے لگی — اُتر کر وہ در پر چمکنے لگی

۸۶ ریاض سنہ ۱۸۶۳ء

ریاض ۔ منشی ریاض احمد خلف سید طفیل احمد خیرآبادی سابق ایڈیٹر ریاض الاخبار

عاشقانہ معاملات اور رندانہ مضامین خوب ادا کرتے ہیں۔ امیر مینائی کے شاگردوں میں ممتاز ہیں۔ کلام میں شوخی کا پورا انداز ہے۔ کہنہ مشق ہیں۔ اب محمود آباد کی ریاست سے وظیفہ پاتے ہیں۔ اپنے وطن خیرآباد میں مقیم ہیں۔ دیوان زیر طبع ہے۔ سال پیدایش تقریباً [illegible]ھ مطابق [illegible]ء ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

١٩٥ غزل

تربت ہماری دیدۂ حسرت چمن میں تھی
محتاج چار پھولوں کی تربت چمن میں تھی

اُجڑا جب آشیاں تو خزاں کیا بہار کیا
تنکوں سے آشیاں کے محبت چمن میں تھی

چننا نہ پھول پاؤں کے کانٹے نکالتا
اے جوشِ گل مجھے کہاں فرصت چمن میں تھی

صحرا کی دیکھ بھال بھی کچھ تھی مری سپرد
نکلے جنوں چمن کے یہ خدمت چمن میں تھی

ہم لے کے کنج باغ میں بیٹھے تھے چھپ کے ہم
بزمِ چمن سے دور یہ خلوت چمن میں تھی

صیاد گھر ترا مجھے جنت سہی" مگر"
جنت سے بھی سوا مجھے راحت چمن میں تھی

چنگاریاں جو باغ میں پھیلی تھیں پھول تھے
بادِ بہار کی یہ شرارت چمن میں تھی

قید قفس میں جان بھی نکلی نہ ضعف سے
رکھی ہے اب قفس میں جو طاقت چمن میں تھی

رہتا تھا ہم سے دور بہت شورِ باغباں
آزادیوں کی سچی مسرت چمن میں تھی

ساماں سب تھے آج خدا نے بچا لیا
توبہ کے بعد کچھ مری نیت چمن میں تھی

کل ہم گئے تھے دیکھ کے آنسو ٹپک پڑے
بے شمع و گل ریاض کی تربت چمن میں تھی

۸۷ مضطر ۱۸۶۴ء

مضطر۔ سید افتخار حسین ولد مولانا سید حافظ احمد حسین رضوی ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۴ء کو پیدا ہوئے۔ آپ شمس العلما مولانا محمد عبدالحق صاحب منطقی کے حقیقی بھانجے ہیں۔ عربی، فارسی کی تعلیم اپنی والدہ ماجدہ سے حاصل کی جو اپنے زمانے کی لائق ادیبہ تھیں۔ فن شعر میں حضرت امیر مینائی سے تلمذ ہے۔ طبیعت حاضر پائی ہے۔ بہت زود گو ہیں۔ نواب صاحب ٹونک کے استاد ہیں۔ افتخار الشعرا کا خطاب حاصل ہے۔ اب ریاست گوالیار میں ملازم ہیں۔ ایک دیوان "نذر خدا" جو توحید میں ہے چھپ گیا ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

۱۹۶ غزل

سچ یہ ہے کہ ہیں کون متاعِ دل و دیں کا
وہ آپ ہی مالک ہیں سب کچھ ہے انہیں کا

چھانا ہے جگر میری دعاؤں نے فلک کا
پیسا ہے کلیجا مرے نالوں نے زمیں کا

دن رات تمنا ہمیں کچھ کچھ ہے کسی کی
دن رات تصور ہمیں کچھ کچھ ہے کہیں کا

وہ وصل کی خواہش پہ یہ منہ دیکھ کے بولے
لکھا تو مٹا ڈال خطِ لوحِ جبیں کا

گویا مرے جینے کا مزہ موت نے مضطر
اللہ کرے صبر پڑے جانِ حزیں کا

۸۸ جلیل سنہ ۱۸۶۹ء

جلیل۔ حافظ جلیل حسن ابن مولوی حافظ عبدالکریم صاحب۔ مانک پور ضلع الہ آباد کے رہنے والے۔ پچاس سال کے قریب عمر ہے۔ سال ولادت تقریباً سنہ ۱۸۶۹ء مطابق سنہ ۱۲۸۶ھ۔ بیس سال کی عمر میں حضرت امیر مینائی کے بمقام رام پور شاگرد ہوئے۔ تمام و کمال فیض اُنھیں سے حاصل کیا۔ اب اُن کے جانشین کہلاتے ہیں۔ امیر اللغات کے دفتر میں عرصے تک سکریٹری رہ چکے ہیں۔ حیدرآباد میں بھی منشی صاحب کے ہمراہ تھے۔ اس وقت سرکار نظام کے سلسلۂ ملازمت میں داخل ہیں۔ نواب فصاحت جنگ کے خطاب سے سرفراز ہیں۔ دو دیوان شائع ہو چکے ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

۱۹۷ غزل

حسن و الفت میں خدا نے ربط پیدا کر دیا
درد دل مجھ کو دیا۔ تم کو مسیحا کر دیا

خوب کی تقسیم تو نے اے خیالِ زلفِ یار
دل کو نذرِ داغ، سر کو وقفِ سودا کر دیا

جان لے لینا جلانا کھیل ہے معشوق کا
آنکھ سے مارا لبِ نازک سے زندہ کر دیا

مجھ کو شکوہ ہے کہ دل کا خون قاتل نے کیا
دل یہ کہتا ہے مجھے قطرے سے دریا کر دیا

ناز ہو یا دلبری، افسوں ہو یا جادو گری
سب کو قدرت نے تمہاری چتون کا حصہ کر دیا

دل اِدھر رخصت ہوا ہوش اُس طرف چلتے ہوئے ‏ کس کی آنکھوں نے یہ در پردہ اشارہ کر دیا

میں کہاں الفت کہاں یہ سب کرشمے دل کے ہیں ‏ تم پہ خود شیدا ہوا مجھ کو بھی شیدا کر دیا

مرحبا اے ساقیِ جادو نظر صد مرحبا ‏ مست آنکھوں نے مرا نشہ دوبالا کر دیا

میں نہ ایسا جانتا تھا تیری چشمِ شوخ کو ‏ فتنے برپا کرتے کرتے حشر برپا کر دیا

دل تڑپتا ہے تو کچھ تسکین ہوتی ہے جلیل
جی بہلنے کو خدا نے درد پیدا کر دیا

١٩٨

دردِ دل لاکھ کہو اُن پہ اثر کچھ بھی نہیں ‏ دل میں رہتے ہیں مگر دل کی خبر کچھ بھی نہیں

دیکھنے کو تو سبھی رکھتے ہیں آنکھیں لیکن ‏ تو نظر آئے نہ جس کو وہ نظر کچھ بھی نہیں

کیا محبت یونہیں دو دل میں ہوا کرتی ہے ‏ اِس طرف جان پہ آ بنتی ہے اُدھر کچھ بھی نہیں

شمع اس فکر سے محفل میں گھلی جاتی ہے ‏ رات بھر کا ہے سماں وقتِ سحر کچھ بھی نہیں

ہو چکی دیدۂ گریاں کی گہر افشانی ‏ اب تو دامن میں بجز لختِ جگر کچھ بھی نہیں

آ چکی ہے شبِ فرقت میں قیامت سو بار ‏ اور ابھی خیر سے آثارِ سحر کچھ بھی نہیں

یاس ہوتی ترے ملنے سے تو بہتر ہوتا ‏ نخلِ اُمید سے اُمید ثمر کچھ بھی نہیں

کوئے جاناں میں یہ جانے کا نتیجہ ہے جلیل
کھو گئے ہوش کچھ ایسے کہ خبر کچھ بھی نہیں

(۸۹) اقبال سنہ ۱۸۷۶ء

اقبال۔ شیخ محمد اقبال۔ ایم۔ اے سنہ ۱۲۹۳ھ مطابق سنہ ۱۸۷۶ء میں اپنے وطن سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ طرزِ جدید کے شعرا میں نامور ہیں۔ فارسی میں اعلیٰ درجہ کی استعداد رکھتے ہیں۔ عربی اور سنسکرت میں بھی کسی قدر دخل ہے انگریزی میں ایم اے پاس ہیں۔ تعلیم انگلستان اور جرمنی میں پائی۔ آپ کو ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری بھی مل چکی ہے۔ لاہور میں بیرسٹر ایٹ لا ہیں۔ شاعری کا شغل بھی جاری رہتا ہے علوِ تخیل اور پرواز فکر ان کی شاعری کا سب سے بڑا وصف ہے ان کا کلام رموزِ فطرت اور مناظر قدرت سے ان کی محبت کا پتا دیتا ہے ان کا یہ ترانہ ملک بھر میں مشہور ہے:۔

۱۹۹ ترانہ

چین و عرب ہمارا۔ ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

دنیا کے بتکدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا

تیغوں کے سایہ میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں
خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
ممکن نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا

اے ارضِ پاک تیری حرمت پہ کٹ مرے ہم
ہے خوں تری رگوں میں اب تک رواں ہمارا

مغرب کی وادیوں میں گونجی اذاں ہماری
تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا

اے موجِ دجلہ تو بھی پہچانتی ہے ہم کو
اب تک ہے تیرا دریا افسانہ خواں ہمارا

اے گلستانِ اندلس وہ دن ہیں یاد تجھ کو
تھا تیری ڈالیوں میں جب آشیاں ہمارا

سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا
اِس نام سے ہے نامی آرام جاں ہمارا

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

۲۰۰

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی۔ یہ گلستاں ہمارا

غربت میں ہم اگر ہوں۔ رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا۔ آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ جہاں ہمارا

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

۲۰۱

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

تجھے کیا بتاؤں اے ہم نشیں ہمیں سب ہے جو مزا ملا
نہ ملا مسیح و خضر کو بھی وہ نشاطِ عمرِ دراز میں

نہ بچا بچا کے تو رکھ اسے ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں

زمانہ آیا ہی بے حجابی کا وصلِ دیدارِ یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

نہیں رہا اب وہ دور ساقی۔ کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
جہان سارا بنے گا مے خانہ ہر کوئی بادہ خوار ہوگا

سفینۂ برگِ گل بنالے گا۔ کارواں مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا کے پار ہوگا

کبھی جو آوارۂ جنوں تھے۔ وہ بستیوں میں پھر آبسیں گے
برہنہ پائی وہی رہے گی مگر نیا خار زار ہوگا

چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہی داغ اپنا کلی کلی کو
وہ یہ سمجھتا ہی اس دکھاوے سے دل جلوں میں شمار ہوگا

نہ پوچھ اقبال کا ٹھکانا ابھی وہی کیفیت ہی اس کی
کہیں سرِ رہ گزار بیٹھا ستم کشِ انتظار ہوگا

۲۰۲

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا۔ نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
میں ہلاکِ جادوئے سامری۔ تو قتیلِ شیوۂ آذری

میں نوائے سوختہ در گلو۔ تو پریدہ رنگ رمیدہ بو

میں حکایتِ غمِ آرزو - تو حدیثِ ماتمِ دلبری
مرا عیش غم - مرا شہد سم - مری بود ہم نفسِ عدم
ترا دل حرم گروِ عجم - ترا دیں خریدۂ کافری
تری راکھ میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری
کوئی ایسی طرزِ طواف تو مجھے اے چراغِ حرم بتا
کہ ترے پتنگ کو پھر عطا ہو وہی سرشتِ سمندری
گلۂ جفائے وفا نما کہ حرم کو اہلِ حرم سے ہے
کسی بتکدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری
کرم اے شہِ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظرِ کرم
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنہیں دماغِ سکندری

۲۰۳ شکوہ

کیوں زیاں کار بنوں - سود فراموش رہوں
فکرِ فردا نہ کروں - محوِ غمِ دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہم نوا میں بھی کوئی گل ہوں - کہ خاموش رہوں

جرأت آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم
قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم
سازِ خاموش ہیں فریاد سے معمور ہیں ہم
نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو معذور ہیں ہم

اے خدا شکوۂ اربابِ وفا بھی سن لے
خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلا بھی سن لے

تھی تو موجود ازل سے ہی تری ذاتِ قدیم
پھول تھا زیبِ چمن پر نہ پریشاں تھی شمیم
شرطِ انصاف ہے اے صاحبِ الطافِ عمیم
بوئے گل پھیلتی کس طرح جو ہوتی نہ نسیم

ہم کو جمعیتِ خاطر یہ پریشانی تھی
ورنہ امت ترے محبوب کی دیوانی تھی

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر
کہیں مسجود تھے پتھر کہیں معبود شجر
خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر
مانتا پھر کوئی اَن دیکھے خدا کو کیونکر

تجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا
قوتِ بازوئے مسلم نے کیا کام ترا

بس رہے تھے یہیں سلجوق بھی تورانی بھی
اہلِ چیں چین میں ایران میں ساسانی بھی
اسی معمورے میں آباد تھے یونانی بھی
اسی دنیا میں یہودی بھی تھے نصرانی بھی

پر ترے نام پہ تلوار اٹھائی کس نے
بات جو بگڑی ہوئی تھی وہ بنائی کس نے

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں
خشکیوں میں کبھی لڑتے کبھی دریاؤں میں

دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں

شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

ہم جو جیتے تھے تو جنگوں کی مصیبت کے لیے
اور مرتے تھے ترے نام کی عظمت کے لیے
تھی نہ کچھ تیغ زنی اپنی حکومت کے لیے
سر بکف پھرتے تھے کیا دہر میں دولت کے لیے؟

قوم اپنی جو زر و مال جہاں پر مرتی
بت فروشی کے عوض بت شکنی کیوں کرتی

ٹل نہ سکتے تھے اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے
پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے تھے
تجھ سے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے
تیغ کیا چیز ہے ہم توپ سے لڑ جاتے تھے

نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
زیر خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے

تو ہی کہہ دے کہ اکھاڑا در خیبر کس نے
شہر قیصر کا جو تھا اس کو کیا سر کس نے
توڑے مخلوق خداوندوں کے پیکر کس نے
کاٹ کر رکھ دیئے کفار کے لشکر کس نے

کس نے ٹھنڈا کیا آتش کدۂ ایراں کو
کس نے پھر زندہ کیا تذکرۂ یزداں کو

کون سی قوم فقط تیری طلبگار ہوئی
اور تیرے لیے زحمت کش پیکار ہوئی
کس کی شمشیر جہاں گیر جہاں دار ہوئی
کس کی تکبیر سے دنیا تری بیدار ہوئی

کس کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے
منہ کے بل گر کے ہو اللہ احد کہتے تھے

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقت نماز
قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قوم حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

محفل کون و مکاں میں سحر و شام پھرے
مئے توحید کو لے کر صفت جام پھرے
کوہ میں دشت میں لیکر ترا پیغام پھرے
اور معلوم ہے تجھ کو کبھی ناکام پھرے

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے
نوع انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے
تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے
تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے

پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں تو بھی تو دلدار نہیں

امتیں اور بھی ہیں ان میں گنہگار بھی ہیں
عجز والے بھی ہیں مست مئے پندار بھی ہیں
ان میں کاہل بھی ہیں غافل بھی ہیں ہشیار بھی ہیں
سیکڑوں ہیں کہ ترے نام سے بیزار بھی ہیں

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر

۱۵

برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

بت صنم خانوں میں کہتے ہیں مسلمان گئے
ہے خوشی اُن کو کہ کعبے کے نگہبان گئے
منزلِ دہر سے اونٹوں کے حدی خوان گئے
اپنی بغلوں میں دبائے ہوئے قرآن گئے

خندہ زن کفر ہے ۔ احساس تجھے ہے کہ نہیں؟
اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں؟

یہ شکایت نہیں، ہیں اُن کے خزانے معمور
نہیں محفل میں جنھیں بات بھی کرنے کا شعور
قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور
اور بیچارے مسلماں کو فقط وعدۂ حور

اب وہ الطاف نہیں، ہم پہ عنایات نہیں
بات یہ کیا ہے کہ پہلی سی مدارات نہیں

کیوں مسلمانوں میں ہے دولتِ دنیا نایاب
تیری قدرت تو ہے وہ جس کی نہ حد ہے نہ حساب
تو جو چاہے تو اُٹھے سینۂ صحرا سے حباب
رہروِ دشت ہو سیلی زدۂ موجِ سراب

طعنِ اغیار ہے، رسوائی ہے، ناداری ہے
کیا ترے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے

بنی اغیار کی اب چاہنے والی دنیا
رہ گئی اپنے لیے ایک خیالی دنیا
ہم تو رخصت ہوئے اوروں نے سنبھالی دنیا
پھر نہ کہنا ہوئی توحید سے خالی دنیا

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے

تیری محفل بھی گئی، چاہنے والے بھی گئے
شب کی آہیں بھی گئیں، صبح کے نالے بھی گئے
دل تجھے دے بھی گئے، اپنا صلا لے بھی گئے
آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے

آئے عشاق۔ گئے وعدۂ فردا لے کر
اب انھیں ڈھونڈ؟ چراغِ رُخِ زیبا لے کر

دردِ لیلیٰ بھی وہی۔ قیس کا پہلو بھی وہی
نجد کے دشت و جبل میں رمِ آہو بھی وہی
عشق کا دل بھی وہی، حُسن کا جادو بھی وہی
اُمتِ احمدِ مرسل بھی وہی تو بھی وہی

پھر یہ آزردگیِ غیر سبب کیا معنی؟
اپنے شیداؤں پہ یہ چشمِ غضب کیا معنی؟

تجھ کو چھوڑا کہ رسولِ عربی کو چھوڑا
بت گری پیشہ کیا، بت شکنی کو چھوڑا
عشق کو، عشق کی آشفتہ سری کو چھوڑا
رسمِ سلمان و اویسِ قرنی کو چھوڑا

آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں
زندگی مثلِ بلالِ حبشی رکھتے ہیں

عشق کی خیر؟ وہ پہلی سی ادا بھی نہ سہی
جادہ پیمائیِ تسلیم و رضا بھی نہ سہی
مضطرب دل صفتِ قبلہ نما بھی نہ سہی
اور پابندیِ آئینِ وفا بھی نہ سہی

کبھی ہم سے، کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں۔ تو بھی تو ہرجائی ہے

سرِ فاراں پہ کیا دین کو کامل تو نے
اک اشارے میں ہزاروں کے لیے دل تو نے

آتش اندوز کیا عشق کا حاصل تو نے
پھونک دی گرمیٔ رخسار سے محفل تو نے

آج کیوں سینے ہمارے شرر آباد نہیں؟
ہم وہی سوختہ ساماں ہیں تجھے یاد نہیں؟

وادیٔ نجد میں وہ شورِ سلاسل نہ رہا
قیس دیوانۂ نظارۂ محمل نہ رہا
حوصلے وہ نہ رہے ہم نہ رہے، دل نہ رہا
گھر یہ اجڑا ہے کہ تو رونقِ محفل نہ رہا

اے خوش آں روز کہ آئی و بصد ناز آئی
بے حجابانہ سوئے محفلِ ما باز آئی

بادہ کش غیر ہیں گلشن میں لبِ جو بیٹھے
سنتے ہیں جام بکف نغمۂ کوکو بیٹھے
دور ہنگامۂ گلزار سے یکسو بیٹھے
تیرے دیوانے بھی ہیں منتظرِ ہو بیٹھے

پھر پتنگوں کو مذاقِ تپش اندوزی دے
برقِ دیرینہ کو فرمانِ جگر سوزی دے

قومِ آوارہ عناں تاب ہے پھر سوئے حجاز
لے اڑا بلبلِ بے پر کو مذاقِ پرواز
مضطرب باغ کے ہر غنچے میں ہے بوئے نیاز
تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز

نغمے بیتاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لیے
طور مضطر ہے اسی آگ میں جلنے کے لیے

مشکلیں امتِ مرحوم کی آساں کر دے
مورِ بے مایہ کو ہمدوشِ سلیماں کر دے
جنسِ نایابِ محبت کو پھر ارزاں کر دے
یعنی اہم دیر نشینوں کو مسلماں کر دے

بوئے خوں می چکد از حسرتِ دیرینۂ ما
می تپد نالہ بہ نشتر کدۂ سینۂ ما

بوئے گل لے گئی بیرونِ چمن رازِ چمن
عہدِ گل ختم ہوا۔ ٹوٹ گیا سازِ چمن

کیا قیامت ہے کہ خود پھول ہیں غمّازِ چمن
اُڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پردازِ چمن

ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنّم اب تک
اُس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

قمریاں شاخِ صنوبر سے گریزاں بھی ہوئیں
وہ پرانی روشیں باغ کی ویراں بھی ہوئیں

پتیاں پھول کی جھڑ جھڑ کے پریشاں بھی ہوئیں
ڈالیاں پیرہنِ برگ سے عریاں بھی ہوئیں

قیدِ موسم سے طبیعت رہی آزاد اُس کی
کاش گلشن میں سمجھتا کوئی فریاد اُس کی

لطف مرنے میں ہے باقی نہ مزہ جینے میں
کتنے بیتاب ہیں جوہر مرے آئینے میں

کچھ مزہ ہے تو یہی خونِ جگر پینے میں
کس قدر جلوے تڑپتے ہیں مرے سینے میں

اس گلستاں میں مگر دیکھنے والے ہی نہیں
داغ جو سینے میں رکھتے ہیں وہ لالے ہی نہیں

چاک اس بلبلِ تنہا کی نوا سے دل ہوں
یعنی پھر زندہ نئے عہدِ وفا سے دل ہوں

جاگنے والے اسی بانگِ درا سے دل ہوں
پھر اُسی بادۂ دیرینہ کے پیاسے دل ہوں

عجمی خم ہے تو کیا، مے تو حجازی ہے مری

نغمہ ہندی ہے تو کیا! لے تو حجازی ہے مری

۹۰ ناظر سنہ ۱۸۷۲ء

ناظر۔ چودھری خوشی محمد خاں بہادر خلف چودھری مولی داد خاں۔ ہریا والا ضلع گجرانوالہ کے باشندے ہیں۔ سال پیدائش تقریباً ۱۸۷۲ء مطابق ۱۲۹۰ھ ہے۔ ۱۸۹۳ء میں علی گڑھ کالج سے بی۔ اے پاس کیا۔ زمانہ طالب علمی سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ فن سخن میں خواجہ حالی مرحوم کے شاگرد ہیں۔ ریاست کشمیر میں عہدۂ گورنری پر مامور ہیں۔ غزل گو نہیں ہیں صرف حالیہ نظمیں لکھتے ہیں جو علو خیال کے لحاظ سے پسند کی جاتی ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے:۔

۲۰۴ جوگی

کل صبح کے مطلع تاباں سے جب عالم بقعۂ نور ہوا — سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا
مستانہ ہوائے گلشن تھی جانانہ ادائے گلبن تھی — ہر وادی وادیٔ ایمن تھی۔ ہر کوہ پہ جلوۂ طور ہوا
جب بادِ صبا مضراب بنی۔ ہر شاخ نہال رباب بنی — شمشاد و چنار ستار بنے۔ ہر سرو و سمن طنبور بنا
سب طائر مل کر گانے لگے۔ عرفان کی تانیں اڑانے لگے — اشجار بھی وجد میں آنے لگے۔ دلکش وہ سماع ظہور ہوا
سبزے نے بساط بچھائی تھی۔ اور بزم سرور سجائی تھی — بن میں گلشن میں آنگن میں فرش سنجاب و سمور ہوا
تھا دلکش منظر دشت و جبل۔ اور چال صبا کی مستانہ — اس حال میں ایک پہاڑی پر جا نکلا ناظر دیوانہ

چیلوں نے جھنڈے گاڑے تھے۔ پربت پر چھاونی چھائی تھی
تھے خیمے ڈیرے بادل کے۔ کُہرے نے قنات لگائی تھی
یاں برف کے تودے گلتے تھے۔ چاندی کے فوارے چلتے تھے
چشمے سیماب اُگلتے تھے۔ نالوں نے دھوم مچائی تھی
یاں قلّۂ کوہ پہ رہتا تھا۔ ایک مست قلندر بیراگی
تھی راکھ جٹاؤں میں جوگی کی اور رنگ بھبوت رمائی تھی
تھا راکھ کا جوگی کا بستر۔ اور راکھ کا پیراہن تن پر
تھی ایک لنگوٹی زیب کمر۔ جو گھٹنوں تک لٹکائی تھی
سب خلقِ خدا سے بیگانہ۔ وہ مست قلندر دیوانہ
بیٹھا تھا جوگی مستانہ۔ آنکھوں میں مستی چھائی تھی
جوگی سے آنکھیں چار ہوئیں۔ اور جھک کر میں نے سلام کیا
تب آنکھ اٹھا کر ناظر سے۔ یوں بن باسی نے کلام کیا

کیوں بابا ناحق جوگی کو۔ تم کس لیے آکے ستاتے ہو
میں پنکھ پکھیرو بن باسی۔ تم جال میں آکے پھنساتے ہو
کوئی جھگڑا دال چپاتی کا۔ کوئی دعویٰ گھوڑے ہاتھی کا
کوئی شکوہ سنگھی ساتھی کا۔ تم ہم کو سنانے آتے ہو

ہم حرص و ہوا کو چھوڑ چکے ۔ اس نگری سے منہ موڑ چکے

ہم جو زنجیریں توڑ چکے ۔ تم لا کے وہی پہناتے ہو

تم پوجا کرتے ہو دھن کی ۔ ہم سیوا کرتے ہیں ساجن کی

ہم جوت جگاتے ہیں من کی ۔ تم اس کو آ کے بجھاتے ہو

سنسار سے یاں مکھ پھیرا ہے ۔ من میں ساجن کا ڈیرا ہے

یاں آنکھ لڑائی پیتم سے ۔ تم کس سے آنکھ ملاتے ہو

اس مست قلندر جوگی نے جب ناظر پہ یہ عتاب کیا

کچھ دیر تو ہم خاموش رہے ۔ پھر جوگی سے یہ خطاب کیا

ہیں ہم پردیسی سیلانی ۔ مت ناحق طیش میں آ جوگی

ہم آئے تھے تیرے درشن کو ۔ چتون پہ میل نہ لا جوگی

آبادی سے منہ پھیرا کیوں ۔ پربت میں کیا ہے ڈیرا کیوں

ہر محفل میں ہر منزل میں ہر دل میں ہے نورِ خدا جوگی

کیا مسجد میں کیا مندر میں سب جلوہ ہے وجہ اللہ کا

پربت میں نگر میں ساگر میں ہر اترا ہے ہر جا جوگی

جی شہر میں خوب بہلتا ہے ۔ واں حسن پہ عشق مچلتا ہے

واں پریم کا ساغر چلتا ہے ۔ چل کے دل بہلا جوگی

واں دل کا غنچہ کھلتا ہے۔ ہر رنگ میں موہن ملتا ہے
چل شہر میں سنکھ بجا جوگی۔ بازار میں دھونی رما جوگی

ان چکنی چپڑی باتوں سے مت جوگی کو پھسلا بابا
جو آگ بجھائی جتنوں سے۔ پھر اس پہ نہ تیل گرا بابا
ہے شہر دل میں غل شور بہت۔ اور حرص و ہوا کا زور بہت
بستے ہیں نگر میں چور بہت۔ سادھو کی ہے بن میں جا بابا
ہے شہروں میں شورش نفسانی۔ جنگل میں ہے جلوہ نورانی
ہے نگری ڈگری کثرت کی۔ بن وحدت کا دریا بابا
ہم جنگل کے پھل کھاتے ہیں۔ چشموں سے پیاس بجھاتے ہیں
راجہ کے نہ دوارے جاتے ہیں۔ پرجا کی نہیں پروا بابا
سر پر آکاس کا منڈل ہے دھرتی پہ سہانی مخمل ہے
دن کو سورج کی محفل ہے شب کو تاروں کی سبھا بابا
جب جھوم کے یاں گھن آتے ہیں۔ مستی کا رنگ جماتے ہیں
چشمے طنبور بجاتے ہیں۔ گاتی ہے ملار ہوا بابا
یاں پنچھی مل کر گاتے ہیں۔ پیتم کے سندیس سناتے ہیں
یاں روپ انوپ دکھاتے ہیں۔ پھل پھول اور گیا بابا

ہی پیٹ کا ہر دم دھیان تمہیں ۔ اور یاد نہیں بھگوان تمہیں
سل پتھر اینٹ مکان تمہیں ۔ دیتے ہیں سکھ سے چھڑا بابا

تن من کو دھن میں لگاتے ہو ۔ ہتیم کو دل سے بھلاتے ہو
ماٹی میں لعل گنواتے ہو ۔ تم بندۂ حرص و ہوا بابا

دھن دولت آنی جانی ہی یہ دنیا رام کہانی ہی
یہ عالم ۔ عالم فانی ہی ۔ باقی ہی ذات خدا بابا

1927 1293 644	۹۱ احسن ۱۸۷۵ء	1348 1293 55 Years

احسن، سید علی احسن خلف حاجی سید مجتبی احسن صاحب قصبہ مارہرہ ضلع ایٹہ کے پیرزادوں میں ہیں۔ شوال ۱۲۹۳ھ میں پیدا ہوئے۔ کم سنی سے شاعری کا شوق ہی۔ حضرت داغ کے مشہور تلامذہ سے ہیں۔ فارسی میں خاصی مہارت ہی۔ عربی میں بھی دخل ہی۔ رسالہ فصیح الملک آپ کی ادارت سے جاری تھا نمونہ کلام یہ ہی:-

۲۰۵ غزل

دنیا کا بھروسہ نہ سہارا مجھے دیں کا
قسمت میں جو ہونا ہی وہ ہو کر ہی رہے گا

اس عشق بدانجام نے رکھا نہ کہیں کا
لکھا ہوا مٹتا ہی کہیں لوح جبیں کا

تم نالۂ مظلوم کو بے کار نہ سمجھو
پا یہ نہ ہلادے وہ کہیں عرش بریں کا
ایسوں کو ستانا نہیں اچھا نہیں اچھا!
لے صبر نہ اے چرخ کسی گوشہ نشیں کا

احسن کی تسلی تو ذرا کیجیے آکر
اب آہی گیا وقت دمِ بازپسیں کا

۲۰۶

بنی ہے دم پہ تو ایسا خیال ہوتا ہے
وگرنہ ترکِ تعلق محال ہوتا ہے
جما ہوا ہے تصور کچھ اس طرح دل میں
کہ خواب میں بھی اسی کا خیال ہوتا ہے
عتاب میں نہیں رکتی نقاب چہرے پر
عیاں جلال میں اُن کا جمال ہوتا ہے
صفِ نیاز میں رہتا ہے سربلند وہی
تمہارے ہاتھ سے جو پائمال ہوتا ہے
ترے ستم پہ یہ ہوتا ہے دل کہ قطع کردں
مگر پھر اپنے کیے کا خیال ہوتا ہے

امیدِ صلح نہ رکھ بدمزاج سے احسن
کہ اس سے میل کے بدلے ملال ہوتا ہے

۹۲ حسرت ۱۸۷۵ء

حسرت۔ فضل الحسن۔ خلف سید اظہر حسن صاحب۔ موہان ضلع اناؤ کے باشندے ہیں۔ سال پیدائش تقریباً ۱۸۷۵ء مطابق ۱۲۹۳ھ ہے ۱۹۱۳ء میں

علی گڑھ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی زمانہ طالب علمی سے سخن گوئی کا شوق ہے۔ تسلیم لکھنوی کے شاگرد ہیں۔ ان کا شمار پرگو شعرا میں ہے۔ اردوئے معلّٰی نامی ماہوار رسالے کے ذریعے عرصہ تک زبان اردو کی خدمت کی چار دیوان شائع ہو چکے ہیں۔ دیوان غالب اردو کی شرح بھی لکھی ہے۔ ایک تذکرۃ الشعرا لکھنا شروع کیا تھا جس کے صرف چند حصے شائع ہو کر رہ گئے۔ عرصہ سے اُن کے ادبی شوق پر سیاسی خیالات غالب ہیں۔

۲۰۷ غزل[1]

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

دل بس کہ ہے دیوانہ اُس حسنِ گلابی کا
رنگیں ہے اسی رو سے شاید غمِ فرقت بھی

خود عشق کی بیتابی سب تجھ کو سکھا لیگی
اے حسنِ حیا پرور! شوخی بھی شرارت بھی

رکھتے ہیں مرے دل پر کیوں تہمتِ بیتابی
یاں نالۂ مضطر کی جب مجھ میں نہ قوت بھی

ہیں شاد و صفی شاعر یا شوق و وفا حسرت
پھر ضامن و محشر ہیں اقبال بھی وحشت بھی

لہ یہ غزل بہ حالت قید سنہ ۱۹۰۸ء میں لکھی گئی تھی

ہوائے یار میں بھی رنگ بوئے یار پیدا ہے
یہ رنگیں ماجرائے عشق شیریں کار پیدا ہے

ترے روئے دل آرا کے تصور کا یہ عالم تھا
کہ چشم شوق میں اک حسن کا گلزار پیدا ہے

مرے اصرار مضطر میں نہاں تھی میری مایوسی
ترے اقرار آساں سے ترا انکار پیدا ہے

طریق عشق جاناں ہے جدا گبر و مسلماں کا
یہیں سے اختلاف سبحہ و زنار پیدا ہے

نگاہ آرزو گلچین باغ کامرانی ہے
زبان خواب شکل طالع بیدار پیدا ہے

وفا میری بہ شکل بے زبانی آشکارا تھی
ستم تیرا بہ رنگ پرسش اغیار پیدا ہے

نسیم دہلوی کی پیروی آساں نہیں حسرت
تجھی سے ہے کہ یہ رنگینی گفتار پیدا ہے

۹۳ فانی ۱۸۷۹ء

مولوی شوکت علی خاں بی۔ اے۔ ایل بی بدایونی پیدائش ۱۸۷۹ء بریلی کالج کے گراجویٹ ہیں ۱۹۰۱ء میں علی گڈھ کالج سے ایل ایل بی ہوئے۔ کئی سال تک لکھنؤ میں وکالت کرتے رہے آج کل بریلی میں قیام ہے۔ آپ کا کلام علی گڈھ کالج میگزین اور دیگر ماہوار رسالوں میں اکثر چھپتا ہے۔ اب تک کوئی دیوان شائع نہیں ہوا۔

۳۰۸ غزل

مری میت پہ اُن کا طرز ماتم کس بلا کا ہے
دل بے مدعا سے پوچھتے ہیں مدعا کیا ہے

مری آنکھوں میں آنسو تجھ سے ہمدم کیا کہوں کیا ہے
ٹھہر جائے تو انگارا ہے بہ جائے تو دریا ہے

مری مہر و میوں کا فیض جاری ہے رگ و پے میں
بدن میں جو لہو کی بوند ہے خونِ تمنّا ہے

غبارِ اشک خارستانِ حسرت پاس کے منتظر
ہمارے دل کی دنیا بھی کوئی دنیا میں دنیا ہے

نظر آتے ہیں دل میں آج پھر آثارِ بیتابی
ہم اے امید سمجھے اس میں کچھ تیرا اشارہ ہے

شبِ فرقت میں ہم ہر سانس سے یہ پوچھ لیتے ہیں
جگر تو خیریت سے ہے مزاجِ دل تو اچھا ہے

یہ کیا کہتے ہو فانی سے کہ تیری موت آئی ہے
تم اس ناکام کے دل سے تو پوچھو زندگی کیا ہے

٩٤ چکبست ١٨٨٢ء

چکبست۔ برج نراین کشمیری پنڈت ہیں ١٨٨٢ء مطابق ١٢٩٩ھ میں بمقام فیض آباد پیدا ہوئے۔ وطن لکھنؤ ہے۔ کیننگ کالج لکھنؤ میں بی اے پاس کر کے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ لکھنؤ میں وکالت کرتے ہیں شاعری میں حضرت افضل سے تلمذ ہے رنگ قدیم و جدید دونوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ ناظم و ناثر ہیں۔ ان کی نظموں کا مجموعہ صبح وطن کے نام سے ١٩١٨ء میں شائع ہوا ہے۔ آج کل ایک اردو رسالہ "صبح امید" لکھنؤ سے نکالتے ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

٢٠٩ غزل

عزیزانِ وطن کو غنچہ و برگ و ثمر جانا
خدا کو باغباں اور قوم کو ہم نے شجر جانا

اجل کی نیند میں بھی خوابِ ہستی گر نظر آنا
تو پھر بیکار ہے تنگ آ کے اس دنیا سے مر جانا

چمن زارِ محبت میں اسی نے باغبانی کی — کہ جس نے اپنی محنت ہی کو محنت کا ثمر جانا
وہ سودا زندگی کا ہے کہ غم انساں سہتا ہے — نہیں تو یہی بہت آساں اس جینے سے مر جانا
وہ طبع پاس پرور تے مجھے چشمِ حقیقت دی — کہ شامِ غم کی تاریکی کو بھی نورِ سحر جانا

رامائن کا ایک سین

رخصت ہوا وہ[1] باپ سے لیکر خدا کا نام — راہِ وفا کی منزلِ اول ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام — دامن سے اشک پونچھ کے دل سے کیا کلام

آخر ہے کچھ حدِ ستم و ظلم و جور بھی
ہم کو اداس دیکھ کے غم ہوگا اور بھی

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ خوش خصال — خاموش ماں کے پاس گیا صورتِ خیال
دیکھا تو ایک در میں وہ بیٹھی ہے خستہ حال — سکتہ سا ہو گیا ہے یہ ہے شدتِ ملال

تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویرِ سنگ ہے

کیا جانے کس خیال میں گم تھی وہ بے گناہ — نورِ نظر پہ دیدۂ حسرت سے کی نگاہ
جنبش ہوئی لبوں کو بھری ایک سرد آہ — لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رخ کی راہ

چہرہ کا رنگ حالتِ دل کھولنے لگا
ہر موئے تن زباں کی طرح بولنے لگا

[1] "وہ" کا اشارہ رامچندر جی کی طرف ہے۔

آخر اسیرِ یاس کا قفلِ دہن کھُلا
اِک دفترِ مظالمِ چرخِ کہُن کھُلا

افسانۂ شدآمدِ رنج و محن کھُلا
وا تھا دہانِ زخم کہ بابِ سخن کھُلا

دردِ دل غریب جو صرفِ بیاں ہوا
خونِ جگر کا رنگ سخن سے عیاں ہوا

رو کر کہا خموش کھڑے کیوں ہو میری جان
سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں

ہیں جانتی ہوں جس لیے آئے ہو تم یہاں
لیکن میں اپنے منہ سے نہ ہرگز کہوں گی ہاں

کس طرح بن میں آنکھوں کے تارے کو بھیج دوں
جوگی بنا کے راج دُلارے کو بھیج دوں

دنیا کا ہو گیا ہے یہ کیسا لہو سپید
انجام کیا ہو کوئی نہیں جانتا یہ بھید

اندھا کیے ہوئے ہے زر و مال کی امید
سوچے بشر تو جسم ہو لرزاں مثالِ بید

لکھی ہے کیا حیاتِ ابد ان کے واسطے
پھیلا رہے ہیں جال یہ کس دن کے واسطے

لیتی کسی فقیر کے گھر میں اگر جنم
ڈستا نہ سانپ بن کے مجھے شوکت و حشم

ہوتے نہ میری جان کو سامان یہ بہم
تم میرے لال تھے مجھے کس سلطنت سے کم

میں خوش ہوں پھونک دے کوئی اس تخت و تاج کو
تم ہی نہیں تو آگ لگاؤں گی راج کو

کن کن ریاضتوں سے گزارے ہیں ماہ و سال
دیکھی تمہاری شکل جب اے میرے نونہال

لائے دُلہن جو بیاہ کے شادی ہوئی کمال
آ دفتنہ یہ آئی مجھ پہ ہوئے جب سفید بال

چھٹنی ہوں اُن سے جوگ لیا جن کے واسطے
کیا سب کیا تھا میں نے اسی دن کے واسطے

ایسے بھی نامراد بہت آئیں گے نظر
گھر جن کے بے چراغ رہے آہ عمر بھر
رہتا مرا بھی نخلِ تمنا جو بے ثمر
یہ جانے صبر تھی کہ دعا میں نہیں اثر

لیکن یہاں تو بن کے مقدر بگڑ گیا
پھل پھول لا کے باغِ تمنا اُجڑ گیا

سرزد ہوئے تھے مجھ سے خدا جانے کیا گناہ
منجدھار میں جو یوں مری کشتی ہوئی تباہ
آتی نظر نہیں کوئی امن و اماں کی راہ
اب یاں سے کچھ ہو تو عدم میں ملے پناہ

تقصیر میری خالقِ عالم بحل کرے
آساں مجھ غریب کی مشکل اجل کرے

سُن کر زباں سے ماں کی یہ فریاد درد خیز
اُس خستہ جاں کے دل پہ چلی غم کی تیغ تیز
عالم یہ تھا قریب کہ آنکھیں ہوں اشک ریز
لیکن ہزار ضبط سے رونے سے کی گریز

سوچا یہی کہ جان سے بلبل گزر نہ جائے
ناشاد ہم کو دیکھ کے ماں اور مر نہ جائے

پھر عرض کی یہ مادرِ ناشاد کے حضور
صدمہ یہ شاق عالمِ پیری میں ہے ضرور
مایوس کیوں ہیں آپ یاں ظلم کا ہے کیوں شعور
لیکن نہ دل سے کیجیے صبر و قرار دور

شاید خزاں سے شکلِ عیاں ہو بہار کی
کچھ مصلحت اسی میں ہو پروردگار کی

چل، یہ فریب، یہ سازش، یہ شور و شر
ہونا جو ہے سب اس کے بہانے ہیں سب بسر
اسبابِ ظاہری ہیں نہ ان پر کرو نظر
کیا جانے کیا ہے پردۂ قدرت میں جلوہ گر
خاص اس کی مصلحت کوئی پہچانتا نہیں
منظور کیا اُسے ہے کوئی جانتا نہیں

راحت ہو یا کہ رنج، خوشی ہو کہ انتشار
واجب ہر ایک رنگ میں ہے شکرِ کردگار
تم ہی نہیں ہو کشتۂ نیرنگِ روزگار
ماتم کدہ میں دہر کے لاکھوں ہیں سوگوار
سختی سہی نہیں کہ اُٹھائی کڑی نہیں
دنیا میں کیا کسی پہ مصیبت پڑی نہیں

دیکھے ہیں اس سے بڑھ کے زمانے نے انقلاب
جن سے کہ بیگناہوں کی عمریں ہوئیں خراب
سوزِ دروں سے قلب و جگر ہو گئے خراب
پیری مٹی کسی کی کسی کا مٹا شباب
کچھ بن نہیں پڑا جو نصیبے بگڑ گئے
وہ بجلیاں گریں کہ بھرے گھر اُجڑ گئے

ماں باپ منہ ہی دیکھتے تھے جن کا ہر گھڑی
قائم تھیں جن کے دم سے امیدیں بڑی بڑی
دامن پہ جن کے گرد بھی اُڑ کر نہیں پڑی
ماری نہ جن کو خواب میں بھی پھول کی چھڑی
محروم جب وہ گل ہوئے رنگِ حیات سے

اُن کو جلا کے خاک کیا اپنے ہاتھ سے

کہتے تھے لوگ دیکھ کے گلِ باپ کا لال
اِن بیکسوں کی جان کا بچنا ہے اب محال
ہے کبریا کی شان گزرتے ہیں ماہ و سال
خود دل سے دردِ ہجر کا مٹتا گیا خیال
ہاں کچھ دنوں تو نوحہ و ماتم ہوا کیا
آخر کو رو کے بیٹھ رہے اور کیا کیا

پڑتا ہے جب غریب پہ رنج و محن کا بار
کرتا ہے اس کو صبر عطا آپ کردگار
مایوس ہو کے ہوتے ہیں انساں گناہگار
یہ جانتے نہیں وہ ہے دانائے روزگار
انسان اس کی راہ میں ثابت قدم رہے
گردن وہی ہے امرِ رضا میں جو خم رہے

اور آپ کو تو کچھ بھی نہیں رنج کا مقام
بعدِ سفر وطن میں ہم آئیں گے شاد کام
ہوتے ہیں بات کرنے میں جو دہ برس تمام
قائم امید ہی سے ہے دنیا ہے جس کا نام
اور یوں کہیں بھی رنج و بلا سے مفر نہیں
کیا ہوگا دو گھڑی میں کسی کو خبر نہیں

اکثر ریاض کرتے ہیں پھولوں پہ باغباں
ہے دن کی دھوپ رات کی شبنم انہیں گراں
لیکن جو رنگِ باغ بدلتا ہے ناگہاں
وہ گل ہزار پردوں میں جاتے ہیں رائگاں
رکھتے ہیں جو عزیز انہیں اپنی جاں کی طرح
ملتے ہیں دستِ یاس وہ برگِ حنا کی طرح

نیکن جو پھول کھلتے ہیں صحرا میں بیشمار
دیکھو یہ قدرتِ چمن آرائے روزگار

موقوف کچھ ریاض پہ اُن کی نہیں بہار
وہ ابر و برف و باد میں رہتے ہیں برقرار

ہوتا ہی اُن پہ فضل جو ربِّ کریم کا
موجِ سموم بنتی ہی جھونکا نسیم کا

اپنی نگاہ ہی کرم کارساز پر
جنگل ہو یا پہاڑ سفر ہو کہ ہو حضر

صحرا چمن بنے گا وہ ہی مہرباں اگر
رہتا نہیں وہ حال سے بندے کے بے خبر

اس کا کرم شریک اگر ہی تو غم نہیں
دامانِ دشت دامنِ مادر سے کم نہیں

۹۵ عزیز ۱۸۸۲ء

عزیز - مرزا محمد ہادی - ابن مرزا محمد علی صاحب - شرفاء لکھنؤ سے ہیں ۲۵ ربیع الثانی سنہ ۱۳ھ مطابق سنہ ۱۸۸۲ء کو بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے - فارسی و عربی میں ذی استعداد ہیں - امین آباد ہائی اسکول میں مدرس ہیں - اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں آپ کا کلام حقیقی جذبات کا معیار رہی - علاوہ اور تصانیف کے دیوان اردو "گلکدہ" کے نام سے شائع ہو چکا ہی - نمونہ کلام پیش کیا جاتا ہی -

غزل ۲۱۱

طبقۂ خاک میں اک عالمِ پنہاں نکلا
دل بھر آیا جو سوئے گورِ غریباں نکلا

قبر تک لاش گئی ساتھ ہوا اک عالم
یوں رہا ہو کے ترا قیدیٔ زنداں نکلا

ہاتھ بڑھنا تھا کہ رگ رگ میں لہو دوڑ گیا
پھر وہی مرحلۂ چاکِ گریباں نکلا

روح اس پیکرِ تعمیر کی تھی ویرانی
ذرّے ذرّے میں مرے گھر کے بیاباں نکلا

پردۂ گل سے ہوا فاش جنوں کا پردہ
کون محفل سے تری چاکِ گریباں نکلا

آہ! وہ دل کہ جو تھا معتکفِ استغنا
کوچۂ یار میں منت کشِ درباں نکلا

خودکشی سے بھی ہوئی کار برآری نہ عزیز
سہل جو کام تھا وہ بھی تو نہ آساں نکلا

۲۱۲

حقیقت میں جو سیرِ عالمِ ایجاد کرتے ہیں
وہ ہر ذرّے میں اک دنیا نئی آباد کرتے ہیں

ہمارے ضبط میں پنہاں ہے نظمِ عالمِ ہستی
نہ ہو تم کو یقیں اس کا تو ہم فریاد کرتے ہیں

کوئی دنیا کی قوت اب مٹا سکتی نہیں مجھ کو
زمینِ دل تجھے ہم اس طرح آباد کرتے ہیں

نہ پوچھ اے عشق پڑھا ہے۔ حقیقت اُن کی ہستی کی
جو اپنے ساتھ اس دنیا کو بھی آزاد کرتے ہیں

نکالی جارہی ہیں ہڈیاں کچھ قید خانے سے
اسیرانِ محبت کو وہ آج آزاد کرتے ہیں

بس اب اے روح۔ جلدی اپنے مرکز کی طرف پھر جا
فقط تھا انتظار اس کا وہ کیا ارشاد کرتے ہیں

عدم کے قافلے ہم کو خبر دیتے ہیں آ آکے
عزیزانِ وطن تم کو عزیز اب یاد کرتے ہیں

تمام شد

فہرست نمبر ۱

اس فہرست میں ہر شاعر کو بہ ترتیب حروف تہجی درج کیا گیا ہے اور نمبر صفحہ جس پر اس شاعر کا کلام ملتا ہے اس کے محاذ میں لکھدیا ہے

فہرست نمبر۲

(ب)

(ث)		
ثبات بحر جہاں میں اپنا فقط مثال حباب دیکھا	داغ	۱۶۰
ج		
جاڑے کے مارے چلتے ہوئے پانی تھم گئے	آزاد	۱۷۹
جذب دل کھینچ اسے دست و گریبان ہو کر	جلال	۱۷۵
جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا	میر	۲۱
جس مورچہ پہ پہلی تیغ دو سر گئی	دبیر	۱۲۱
جفا پرور سے امید وفا کیا	اثر	۲۲۰
جفائیں ہوتی ہیں گھٹتا ہے دم ایسا بھی ہوتا ہے	اثر	۱۲۱
جلوہ تیرا راہ فنا میں	فطرت	۱۴۳
جوں غنچہ تو چمن میں بند قبا کو کھولے	سودا	۱۰
جو اس شور سے میر روتا رہے گا	میر	۲۳
جو رنج نوشتہ میں ہے کیونکر نہ ملے گا	رشک	۸۳
جو سرگزشت اپنی ہم کہیں گے کوئی سنے گا تو کیا کریں گے	نظام	۱۱۲
جو گرم ہے حسن اُس نسیں کا نہ وہ پری کا نہ حور عیں کا	مذاق	۱۳۵
جو کھلے پردے کی انگل نہ ہر اشعار ہوتا	اسمٰعیل	۲۱۰
جو سوکھی زمیں پر ترشح ہوا	بے نظیر	۲۴۴
جہاں ویرانہ ہے پہلے کبھی آباد گھر یاں تھے	ظفر	۹۷
جیتے جی موت کے تم منہ میں نہ جانا ہرگز	حالی	۲۰۳

(د)

(ذ)

ہوئی ریعان جوانی کی بہار آخر حیف
ہی کچھ دھوپ کا عکس کہسار پہ
ہی مشق سخن جاری چکّی کی مشقت بھی

(ی)

یا خدا دل میں غم یار کی چھائی ہی
یا رہ جو تاج کج یہاں آنکلا ہی
یا مجھے افسر شاہانہ بنایا ہوتا
یہ دل آشنا اور نا آشنا ہی
یہ رنگ الفت اگر نہ ہوتا تو کچھ خدائی میں کم ہوتا
یہ کہہ کے رخنہ ڈالیے اُن کے حجاب میں
یہ موجودہ طریقے راہی ملک عدم ہوں گے
یہ نور ہی روئے مہ جبیں کا کہ ہو خجل چاند چودھویں کا
یہ نہ تھی ہماری قسمت جو وصال یار ہوتا
یہی نہیں ہی کہ دل کی دھڑکن رہے گی جب تا کہ جا رہے گی

تمام شد

لیتھوگرافر سند یافتہ سٹی اینڈ گلڈس
انسٹی ٹیوٹ لندن کی نگرانی میں طبع ہوا
نظامی پریس
نظام الدین حسین پرنٹر